تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

طاہرہ اقبال کے ناولوں میں تاریخی و سماجی عناصر

بحوالہ نیلی بار، گراں

محقق

محمد تیمور خان

268-FLL/MSURDU/F20

نگران

ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

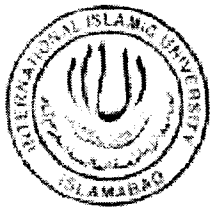

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

TH-27780

MS
891.439301
خ ا ط

اردو ناول ـ تنقید ، اردو ناول ـ شعور

طاہرہ اقبال کے ناولوں میں تاریخی و سماجی عناصر

طاہرہ اقبال کے ناولوں میں تاریخی و سماجی عناصر

بحوالہ نیلی بار، گراں

(تحقیقی مقالہ)

مقالہ نگار

محمد تیمور خان

رجسٹریشن نمبر:268-FLL/MSURDU/F20

مقالہ برائے ایم۔ایس (اُردو)

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

یہ مقالہ

ایم۔ایس اُردو

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

کلیۂ زبان وادب

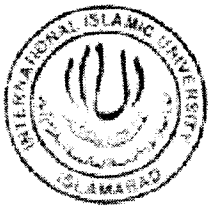

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

درج ذیل مقالہ شعبۂ اُردو، کلیہ زبان وادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں ایم ایس اُردو کی ڈگری کی جزوی منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ زیرِ دستخطی نے یہ مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے اور ایم ایس اُردو کی ڈگری تفویض کرنے کی منظوری دیتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **طاہرہ اقبال کے ناولوں میں تاریخی و سماجی عناصر: بحوالہ نیلی بار اور گراں**

مقالہ نگار: محمد تیمور خان

رجسٹریشن نمبر: 268-FLL/MSURDU/F20

کمیٹی دفاعِ مقالہ

ڈاکٹر سید عون ساجد نقوی
اسسٹنٹ پروفیسر
وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد
بیرونی ممتحن

ڈاکٹر شیراز فضل داد
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
اندرونی ممتحن

ڈاکٹر حمیرا اشفاق
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
نگران مقالہ

ڈاکٹر کامران عباس کاظمی
اسسٹنٹ پروفیسر (اُردو)
آئی آئی یو، اسلام آباد
چیئرمین، شعبہ اردو

اقرار نامہ

میں محمد تیمور خان، رجسٹریشن نمبر268-FLL/MSURDU/F20حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان **"طاہرہ اقبال کے ناولوں میں تاریخی و سماجی عناصر بحوالہ نیلی بار، گراں"** میں پیش کیا گیا کام میری ذاتی کاوش ہے اور سرقے سے پاک ہے۔ میں نے یہ کام بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد کے ایم۔ایس اُردو کے سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر حمیرا اشفاق، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونی ورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ پیش کروں گا۔

محمد تیمور خان

مقالہ نگار

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ محمد تیمور خان رجسٹریشن نمبر 268-FLL/MSURDU/F20 نے ایم۔ایس۔اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"طاہرہ اقبال کے ناولوں میں تاریخی و سماجی عناصر بحوالہ نیلی بار، گراں"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر حمیرا اشفاق

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

بسم الله الرحمن الرحيم

پیش لفظ

الحمدللہ تحقیق کا جو سفر شروع کیا تھا، اللہ پاک کے حکم اور اس کے فضل و کرم سے اختتام کو پہنچا۔ یہ سفر چند لوگوں کی محبت اور تعاون کے بغیر ناممکن تھا لہذا ان کا باقاعدہ شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ اپنے نگرانِ مقالہ ڈاکٹر حمیرا اشفاق صاحبہ کا میں تہہ دل سے ممنون رہوں گا۔ موضوع کے انتخاب، موضوع کی کانٹ چھانٹ سے لے کر موضوع کے دفاع اور تحقیق کے تمام مراحل میں میرا جس طرح ساتھ دیا، کتابیں فراہم کیں، یونیورسٹی کی مصروفیات میں سے وقت نکال کر میری راہ نمائی کی اس سب کے لیے میں ان کا احسان مند ہوں۔ آپ ایک شفیق، مہربان اور علم دوستی کا عملی نمونہ ہیں۔ حقیقی معنوں میں آپ کی نگرانی میں مقالے پر کام کرنا میرے لیے باعث فخر اور باعثِ اعزاز ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ڈین فیکلٹی زبان و ادب ڈاکٹر نجیبہ عارف کا بے حد شکریہ جن کی قیمتی مشوروں اور تعاون سے موضوع کے حوالے سے راہ نمائی ہوئی۔ بے شک ڈاکٹر نجیبہ عارف ایک علمی شخصیت ہیں۔ آپ کی علمی و فکری شخصیت سے استفادہ اٹھانا میری خوش بختی ہے۔ میں شعبے کے تمام اساتذہ ڈاکٹر عزیز ابن الحسن صاحب، ڈاکٹر کامران کاظمی صاحب (صدر شعبہ اردو)، ڈاکٹر ارشد معراج صاحب، ڈاکٹر مظہر علی طلعت صاحب، ڈاکٹر قاسم یعقوب صاحب، ڈاکٹر صفدر رشید صاحب، ڈاکٹر روش ندیم صاحب جیسے قابل اساتذہ سے پڑھنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر صاحب، ڈاکٹر امینہ بی بی صاحبہ اور ڈاکٹر نعیمہ بی بی صاحبہ، عاصمہ نذیر صاحبہ، سدرہ طاہر، سکینہ صدیق صاحبہ، وسیم عباس علی حسین کا ممنون ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً تحقیقی مراحل میں بھرپور تعاون کیا۔

مقالہ لکھنے کے دوران جن دوست احباب نے کتابوں کے ذریعے تعاون کیا ہے ان احباب کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

یونیورسٹی میں ملازمت کی نوعیت اور مصروفیت کے وجہ سے مقالہ لکھنے میں بہت سے مسائل کا سامنا رہا لیکن ایسے مشکل وقت میں اپنی شریک حیات اور بچوں کی طرف سے ملنے والے تعاون کا شکریہ ادا کرنا مشکل بہت مشکل ہے۔ دوران مقالہ والدین کی دعاؤں سے مسائل کا سامنا کرنے میں حوصلہ ملا۔

مقالے لکھنے کے دوران ناول نگار ڈاکٹر طاہرہ اقبال سے رابطہ رہا۔ موضوع سے متعلق ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جوابات جاننے کے لیے انہیں مسلسل تنگ کیا لیکن انہوں نے ہمیشہ تحمل سے میرے سوالات کا تسلی بخش جواب دیا۔ ان کے اس تعاون کے لیے رسمی طور پر شکریہ کہہ دینا بھی مناسب نہیں لیکن میں پھر بھی ان کے اس علمی و ادبی تعاون پر بے حد شکر گزار ہوں۔

میرے مقالے کا عنوان "طاہرہ اقبال کے ناولوں میں تاریخی و سماجی عناصر بحوالہ نیلی بار اور گراں" ہے۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے. پہلے باب میں ادب تاریخ اور ایک مطالعہ کا، اردو ناول میں تاریخ اور سماج کا اجمالی جائزہ اور معاصر اردو ناولوں میں تاریخ و سماج کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ شامل ہے۔ دوسرے باب میں طاہرہ اقبال کے ناول گران اور نیلی بار میں تاریخی عناصر کا تجزیہ کیا ہے۔ تیسرے باب میں طاہرہ اقبال کے ناول گراں اور نیلی بار میں سماجی عناصر کا تجزیہ کیا ہے۔ چوتھے باب میں طاہرہ اقبال کے ناول گراں اور نیلی بار میں تاریخی و سماجی عناصر کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے اور آخر میں مقالے کا مجموعی جائزہ پیش کیا ہے۔

آخر میں مقالے کی علمی و ادبی نوعیت اور معیار کا فیصلہ اہل علم پر چھوڑ رہا ہوں. میری جانب سے یہ ایک ادنی سی کوشش ہے۔ میں اس سلسلے میں ایک مرتبہ پھر اپنی نگران ڈاکٹر حمیرا اشفاق کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کے تعاون سے یہ تحقیقی کام باقاعدہ مقالے کی صورت میں اختتام کو پہنچا۔

محمد تیمور خان

جون ۲۰۲۳ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
	باب اوّل: ادب، تاریخ اور سماج: تعارف و مباحث	۱
الف۔	ادب، تاریخ اور سماج کا باہمی ربط	۱
ب۔	اردو ناول میں تاریخی اور سماجی عناصر کا اجمالی جائزہ	۸
ج۔	معاصر اردو ناولوں میں تاریخ و سماج کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	۱۹
	حوالہ جات	۲۶
	باب دوم: ناول نیلی بار اور گراں میں تاریخی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	۲۸
الف۔	تقسیم اور ہجرت کے واقعات کا جائزہ	۲۹
ب۔	مارشل لا کے ادوار اور جمہوری حکومتوں کے ادوار کا جائزہ	۳۴
ج۔	نائن الیون کے بعد کے حالات کا جائزہ	۵۶
	حوالہ جات	۶۰
	باب سوم: ناول نیلی بار اور گراں میں سماجی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ	۶۳
الف۔	خطۂ پنجاب کی ثقافت کا جائزہ	۶۳
ب۔	سماجی و مذہبی اقدار کا جائزہ	۷۵
ج۔	معاشرے اور اس کے ارتقا کا جائزہ	۸۵
	حوالہ جات	۹۹
	باب چہارم: ناول نیلی بار اور گراں میں تاریخی و سماجی عناصر کا تقابلی جائزہ	۱۰۲
الف۔	ناول گراں اور نیلی بار میں تاریخی عناصر کا تقابلی جائزہ	۱۰۳
ب۔	ناول گراں اور نیلی بار میں سماجی عناصر کا تقابلی جائزہ	۱۱۰
	حوالہ جات	۱۱۸
	ماحصل	۱۱۹
	کتابیات	۱۳۰

باب اوّل

ادب، تاریخ اور سماج:

تعارف و مباحث

باب اوّل:

ادب، تاریخ اور سماج: تعارف و مباحث

الف۔ ادب، تاریخ اور سماج کا باہمی ربط:

ادب کی تخلیق میں ماضی اور حال دونوں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ماضی کے حالات سے آگاہی اور اس کا شعور حاصل کرنے کے لیے ادیب کو جس شعبہ علم کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ تاریخ ہے۔ تاریخ نہ صرف ماضی کے واقعات سے آگاہی دلاتی ہے بلکہ ماضی کے کسی بھی معاشرے کے سماجی منظر نامے سے آشنائی دلانا بھی تاریخ کے فرائض میں شامل ہے۔ یوں ماضی کی بازیافت جب ادب کے ذریعے کرنے کی طرف بڑھا جاتا ہے تو تاریخ اور ماضی کا سماجی منظر نامہ دونوں مل کر ایک ادیب کے لیے راہیں کھولتے ہیں۔ ادیب کا ماضی کو اپنی فکر کا حصہ بنانے کے لیے ایسی تاریخ کی ضرورت ہوتی ہے جو سماجی منظر نامے کی بھی عکاس ہو۔ کوئی بھی واقعہ جب کسی سماج میں رونما ہوتا ہے تو اس کے اثرات ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ یہ ایسے اثرات ہوتے ہیں جو کسی بھی سماج کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وقت کے بہاؤ کے ساتھ سماجی منظر نامے میں ہونے والی تبدیلی بھی تاریخ کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ محض واقعات کا بیان نہیں رہ جاتا بلکہ کسی بھی سماج کا مجموعی جائزہ ہی تاریخ کہلانے کا حق دار ہے۔ ڈاکٹر شیبا عالم تاریخ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> تاریخ کو دریافت کرنے کے لیے زمانی شہادتوں، دستاویزات، آثار و نقوش کے ساتھ ساتھ روایات کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ روایت صدیوں کے عمل سے انسانی شعور، مزاج، یادداشت اور احساس کا حصہ بنتی رہتی ہیں۔[1]

ڈاکٹر شیبا عالم کا یہ بیان اگرچہ تاریخ کے حوالے سے ہے تاہم اگر ہم ادب کے منصب کو دیکھیں تو ادیب بھی کافی حد تک انھی چیزوں سے اپنے لیے مواد حاصل کرتا ہے۔ گویا ایک ادیب جب تاریخی حالات واقعات کو ادب کی زینت بنانے کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے سامنے بھی وہی راہیں ہوتی ہیں جو ایک مؤرخ کے سامنے ہوتی ہیں۔

تاریخ عہد بہ عہد سفر کرتی ہے۔ اس سفر کے دوران میں بہت کچھ ایسا بھی سامنے آتا ہے جسے مؤرخ صرف نظر کرتے ہوئے گزر جاتا ہے لیکن ادیب کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ جب وہ کسی عہد کا تاریخی تناظر

میں جائزہ لیتے ہوئے اس کو ادب کا حصہ بنا رہا ہو تو وہ بھی ان سے صرف نظر کرتے ہوئے گزر جائے۔ ادیب جب اپنا مواد ماضی سے اخذ کرتا ہے تو ماضی کا ہر واقعہ اس کی فکر کو جھنجھوڑتا ہے۔ اسے ماضی کے ہر واقعے سے متاثر ہونا پڑتا ہے۔ وہ ان تمام واقعات کو اپنی تخلیق کا حصہ بنائے یا نہ بنائے لیکن یہ ضروری ہے ان تمام واقعات سے اس کی فکری آگاہی ضروری ہوتی ہے۔ ادب کا فریضہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کا معاون بن کر سامنے آتا ہے۔ ایک ادیب وہ سب کچھ بیان کر دینے پر قادر ہوتا ہے جو تاریخ کا حصہ ہوتا ہے لیکن تاریخ میں ہی دب کر رہ جاتا ہے۔ ان دب جانے والے حقائق کو ادب ہی سامنے لاتا ہے۔ گویا ادیب نہ صرف تاریخ سے مواد حاصل کرتا ہے بلکہ وہ تاریخ کا معاون بھی بنتا ہے۔ وہ تاریخ کی ترجمانی کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شیبا عالم اس ضمن میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> عوام کی آواز تو ویسے بھی دبا دی جاتی ہے تو وہ آواز کیسے مؤرخ تک پہنچے گی؟ یہی وہ پراسرار عمل ہے جو تاریخ کی صداقت کو ثابت کر سکتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جو آوازیں دبا دی جاتی ہیں وہ آوازیں شاعری، ادب، موسیقی، گائیگی، رقص اور ڈرامے میں زندہ ہو جاتی ہیں۔[2]

گویا ادب تاریخ کے متوازی ایک تاریخ کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ نہ صرف تاریخ سے مواد حاصل کرتا ہے بلکہ تاریخ کو تکمیلیت کی طرف لے جانے کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ اگر کسی زبان کا ادب اس کی تاریخ سے بے بہرہ ہو تو اس زبان کو بولنے والوں کی مکمل تاریخ بھی سامنے نہیں آسکتی۔ ادب ہی وہ وسیلہ ہے جو اس سب کو سامنے لاتا ہے جو مؤرخ چھوڑ دیتا ہے۔

ادب، سماج اور تاریخ کے رشتے کو سمجھنے کے لیے اس نکتے کو سمجھنا ضروری ہے کہ بہترین ادب ہنگامی دور میں لکھا جاتا ہے۔ وہ دور جو سماجی سطح پر تعمیر و تخریب کا دور ہو، جس میں ایک طرف سماجی اقدار ٹوٹ پھوٹ رہی ہوں اور ان کے مقابلے میں نئی اقدار جنم لے رہی ہوں، اور یہ عمل ہنگامی بنیادوں پر ہو رہا ہو تو ایسے دور میں لکھا جانے والا ادب زیادہ پر اثر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ہنگامی دور کے اثرات افرادِ معاشرہ کے ذہن پر گہرے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تاریخ کو دیکھا جائے تو وہ بھی ایسے واقعات کو لازمی اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے جو ہنگامی دور کی پیداوار ہوتے ہیں۔ گویا جن واقعات کو ایک مؤرخ تاریخ لکھتے ہوئے اہمیت دیتا ہے وہی واقعات ایک ادیب کے لیے بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ادیب ان واقعات کا کھوج لگانے کے لیے تاریخ کا سہارا بھی لیتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ اور ادب ایک دوسرے کے معاون بن کر ایک دوسرے کے ارتقا میں کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بعض صورتوں میں

لازم وملزوم بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ تعلق دو طرفہ بن جاتا ہے۔ ادب تاریخ سے اپنا مواد حاصل کرتا ہے تو تاریخ اپنے اظہار کے لیے ادب کا سہارا لینے پر مجبور ہوتی ہے۔ اسی طرح سماج بھی ماضی کے تناظر میں تاریخ کا حصہ بن کر ادب میں ظاہر ہوتا ہے جب کہ حال کا حصہ ہونے کی صورت میں وہ ادیب کے مشاہدات اور تخیل کے ذریعے ادب میں ظہور پاتا ہے۔

ادب اور تاریخ کے رشتے کی تفہیم کے حوالے اک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ دنیا میں جتنی بھی تحریکیں اٹھی ہیں، جہاں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے، جہاں بھی انقلاب آیا ہے اس نے تاریخ کو تسلسل بخشا ہے اور ادب اور فنون لطیفہ نے اس تبدیلی اور انقلاب میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ تاریخ اور ادب کے رشتے کے اس تناظر کی تفہیم کے سلسلے میں سبط حسن اپنی تصنیف ماضی کے مزار میں یوں ہماری رہنمائی کرتے ہیں:

> پرانی قوموں کی زندگی میں تاریخی دور سے پہلے ایک نیم اساطیری اور نیم تاریخی دور ضرور آتا ہے۔ اس دور میں انسان کو اپنے ہم جنسوں میں خداوندی صفات نظر آنے لگتی ہیں۔ اس میں خود شناسی کی صلاحیت ابھرتی ہے اور وہ انسان کو بھی ان کارناموں کا اہل سمجھنے لگتا ہے جو اس سے پیشتر فقط دیوی دیوتاؤں سے منسوب کیے جاتے تھے۔[3]

یہاں تاریخ اور اساطیر کا آپس میں تعلق سامنے آتا ہے۔ سبط حسن نے اس حوالے سے اس کتاب میں بہت وضاحت کی ہے۔ آگے چل کر وہ اساطیر اور کہانی یعنی ادب میں تعلق کو یوں سامنے لاتے ہیں:

> انسان کے تخیل نے حقیقت اور مزاج کے امتزاج سے بڑے بڑے فنی شاہکار تخلیق کیے ہیں۔ ایسے شاہ کار جنہیں اہلِ ذوق اب تک لطف لے لے کر پڑھتے ہیں۔ ایلیڈ اور اوڈیسی، مہابھارت اور رامائن، فردوسی کا شاہنامہ، امیر حمزہ کی داستان، حاتم طائی اور چہار درویش کے قصے، غرضیکہ ہر زبان کے ادب میں اس کے امتزاج کے نمونے ملیں گے۔[4]

یہ امتزاج ہی تاریخ اور ادب کے باہمی ربط کو واضح کرتا ہے۔ ادب نے یہ سب واقعات تاریخ سے ہی حاصل کیے اور تاریخ نے ادب کے ذریعے جاودانی حاصل کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادب اور تاریخ کا تعلق ایک دوسرے سے معاون کا تعلق ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ذریعے آگے بڑھتے ہیں۔

ادب اور تاریخ کے ساتھ ساتھ ادب اور سماج کے تعلق کو دیکھا جائے تو یہ بھی خاصا گہرا تعلق ہے۔ تاریخ بھی اپنے اندر سماجی منظر نامے کو سموئے ہوتی ہے۔ یہ سماجی منظر نامہ جب ادب کے ذریعے سامنے آتا ہے تو ادب، تاریخ اور سماج کے تعلق کو بھی سامنے لاتا ہے۔ ہر وہ تحریر جو ادبی مقام و مرتبے کی حامل ہو اس میں

جب کوئی کہانی بیان کی جاتی ہے تو اس کہانی کا تعلق ماضی یا حال کے ساتھ گہرا ہوتا ہے۔ ادیب ماضی سے جب کسی واقعے کو ادب کے پیرائے میں بیان کرتا ہے تو وہ اس واقعے کے پورے سماجی منظر نامے کو بھی ذہن میں رکھتا ہے۔ صرف واقعہ بیان کر دینا ادیب کا کام نہیں ہے۔ یہ صحافی کا کام ہے۔ ادیب اس واقعے کو اپنے تخیل میں ڈھالتا ہے۔ اس کے سماجی اثرات کو سامنے رکھتا ہے، اس کے محرکات تک رسائی حاصل کرتا ہے اور پھر جا کر کہانی کے قالب میں اس کو ڈھالنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس سارے عمل کے دوران میں وہ سماج جس میں وہ واقعہ وقوع پذیر ہوا ہوتا ہے وہ ادیب کے لیے محرک کا کام کرتا ہے۔ یہیں سے ادب اور سماج کے رشتے سے آگاہی ہوتی ہے۔ ادب کو سماج سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ صحافت میں تو صحافی کسی بھی واقعہ کی خبر دے کر الگ ہو جاتا ہے۔ اس واقعے کے سماجی اثرات سے صحافی کو کوئی غرض نہیں ہوتی، جب کہ ادیب نے اپنے تخیل کو اسی سماجی منظر نامے کے ساتھ جوڑ کر ہی آگے بڑھنا ہوتا ہے جس میں وہ واقعہ ہوتا ہے جس پر ادیب کہانی کی بنیاد رکھتا ہے۔ گویا تاریخ کی طرح سماج بھی ادیب کے لیے محرک ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شیبا عالم ادب کا تاریخ اور سماج کے ساتھ تعلق واضح کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> کہانی کا کوئی نام ہو وہ اپنی اصلیت میں پڑھنے اور سننے والے کے لیے بہت کچھ سمیٹے ہوتی ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی زمانہ ہوتا ہے۔ جس میں رہنے والوں کا ایک پورا سماجی عمل ہوتا ہے جو کردار کے ساتھ ساتھ سانس لیتا ہے۔ ایک ثقافتی احساس ہوتا ہے جو ہر واقعے کے کردار کے اندر دھڑک رہا ہوتا ہے۔ ایک اقداری اور اخلاقی نظام ہوتا ہے جو عقیدے اور تصور میں جھلک رہا ہوتا ہے۔ گویا ایک حرکی زندگی اپنی مکمل شکل میں موجود ہوتی ہے۔[5]

یہ حرکی زندگی تاریخ اور سماج دونوں سے ترتیب پاتی ہے۔ تاریخی تسلسل سے ہی اخلاقی اور سماجی اقدار نسل در نسل آگے منتقل ہوتی آتی ہیں اور یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ یہ سماجی اقدار اور تاریخی روایات ایک ادیب کے تخیل کو مہمیز عطا کر کے ادب کے قالب میں ڈھل کر سامنے آتی ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ کہانی کی کوئی بھی صورت ہو، ادب کی کوئی صنف ہو اس میں کسی نہ کسی زمانے اور کسی نہ کسی سماج کی بازگشت لازمی سنائی دیتی ہے۔ کوئی کہانی ایسی نہیں ہو گی جو ادبی مقام و مرتبے کی حامل ہونے کے باوجود سماج کے قدیم یا جدید تصور سے عاری ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کہانی کے اندر سماج کا ارتقائی عمل بھی قارئین کے سامنے آتا ہے۔ سماج کے اس ارتقائی عمل میں حصہ لینے والے تاریخی عوامل اور سماجی کردار کہانی کو تکمیلیت کی طرف لے کر بڑھتے ہیں۔ یہی تکمیلیت کا عمل ادب، تاریخ اور سماج کے رشتے کو مضبوط بناتا ہے۔ جس ادیب

کے ہاں یہ تخلیقی عمل تاریخ اور سماج کے امتزاج سے سامنے آتا ہے، وہ کامیاب ادبی شاہ کار تخلیق کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ گویا ادیب کو ادبی فن پارہ کی تخلیق کے لیے تاریخ اور سماج دونوں سے رشتہ مضبوط کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ادیب اس رشتے کو مضبوط کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اس کے تخلیق کیے ہوئے ادبی فن پارے کا سماجی معیار گر جائے گا۔ ادب، سماج اور تاریخ ایک دوسرے کے لیے کس قدر ضروری ہیں اور ایک ادیب کی سماج اور تاریخ سے تعلق کی نوعیت کیا ہوتی ہے، اس ضمن میں بحث کرتے ہوئے نگینہ جبین لکھتی ہیں:

> جیسے جیسے تحریر نے ترقی کی ویسے ویسے زندگی اور سماج کی تاریخ ادب کی شکل میں نظر آنے لگی۔ انسان نے دنیا میں آکر جو کچھ دیکھا اور اس سے جو کچھ اچھے اور برے تجربات و تاثرات حاصل کیے، ان تاثرات کو لکھنا شروع کیا، اسی لیے ادب زندگی کی تنقید، زندگی کی حقیقت، اس کی مختلف صورتوں، زندگی اور سماج کے تعلق، زندگی بسر کرنے کے مختلف طور طریقے، رہن سہن، اقتصادی اور مادی ترقی، طبقاتی سماج، سیاست اور اس کی ضرورت، مذہب، آرٹ، کلچر، ابتدا سے اب تک انسانی فسادات اور ان کے خونی نتائج حادثات وانقلابات، قوموں کے عروج وزوال کی کہانی ہے۔ ادب کو سماج کا آئینہ کہا گیا ہے۔ اگر سماج کا وجود نہ ہوتا تو ادب بھی نہ ہوتا۔[۲]

اس رائے سے بہت سی چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ ادب تاریخ کے تسلسل ہی قائم رہتا ہے دوسری اہم بات کہ سماج اس تسلسل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تاریخ اپنے تغیر پذیر عمل کے ذریعے روایات اور اقدار اگلی نسلوں تک منتقل کرتی ہے، یہ روایات اور اقدار سماج ہی کہ دین ہوتی ہیں۔ یہ سماج میں ہی پروان چڑھتی ہیں اور کسی بھی خطے کا سماجی منظر نامہ متعین کرنے میں اہم کردار ادار کرتی ہیں۔ ان کا ظہور جب ایک ادیب کے مشاہدے اور تخیل کی آمیزش سے ادب کی صورت میں ہوتا ہے تو نہ صرف وہ تاریخ اور سماج محفوظ ہو جاتے ہیں بلکہ قارئین کو ان سے آگاہی بھی حاصل ہوتی ہے۔

ادب اور سماج کے رشتے کو ماضی کے ساتھ ساتھ حال کے تناظر میں بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ادیب ایک سماجی فرد ہونے کے ناتے جس سماج میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے، اس سماج کے اثرات اس کے فکر و نظر پر پڑتے رہتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ اور تخیل ان حالات و واقعات سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ جب یہ اثرات ادیب کے تخلیقی عمل میں ڈھل کر ادب کی صورت میں سامنے آتے ہیں تو نہ صرف اس سماج کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ اس سماج میں پائی جانے والی کمزوریوں کو دور کرنے اس کے مستقبل کو سنوارنے کے حوالے سے لائحہ عمل بھی سامنے آتا ہے۔ ایک اچھا ادیب نہ صرف اپنے سماج کا چہرہ دکھاتا ہے بلکہ سماج کے منفی رویوں، کمزوریوں اور

ناہمواریوں کو دور کرنے کے حوالے سے ادب کے پیرائے میں ہی تجاویز بھی پیش کرتا ہے۔ گویا ادب سماج کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اس کی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔اس ضمن میں سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

ادب زندگی کا آئینہ ہی نہیں وہ کاروانِ حیات کا رہبر بھی ہے۔اسے محض زندگی کی
ہم رکابی نہیں کرنا بلکہ اس کی رہنمائی بھی کرنا ہے۔[۷]

جس طرح ادب زندگی اور سماج کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے اسی طرح سماج بھی ادب کا نقاد بن کر سامنے آتا ہے۔ گویا تاریخ اور ادب کے تعلق کی طرح سماج اور ادب کا تعلق بھی دو طرفہ ہوتا ہے۔ادب اگر سماج کی درست تفہیم و تشریح کرنے سے قاصر رہتا ہے تو سماجی عناصر ہی ادب کی اصلاح کرنے کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔اس ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے سماج ادب پر تنقید بھی کرتا ہے۔ادب کی درست تفہیم کے لیے ایک قاری کو بھی سماجی منظر نامے سے کسی قدر آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے تبھی وہ ادب میں سماج کی پیش کش کا درست تجزیہ کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اس آگاہی کے عمل میں قاری سماج کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتا ہے اور پھر اس مشاہدے اور مطالعے سے حاصل ہونے والے نتائج کی بنیاد پر ادب کا تجزیہ کرتا ہے۔اگر ادب میں سماج کی عکاسی اور اس کی رہنمائی درست انداز میں نہ ہوئی ہو تو وہ ادیب اپنے معاصرین میں اپنے مقام و مرتبے کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح اچھا ادب تخلیق کرنے کے لیے ادیب کا سماجی مشاہدہ وسعت کا حامل ہونا ضروری ہے، اسی طرح ادب کی تفہیم کے لیے ایک نقاد کا سماجی عوامل کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ گویا ادب کی تخلیق اور اس کی تفہیم و تعبیر دونوں سماج کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہی تخلیق اور تعبیر و تفہیم کا عمل ہی ادب اور سماج کے رشتے کی مضبوطی اور دونوں کے ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔لازم وملزوم ہونے کا یہ تعلق ہی ادب اور سماج کے رشتے میں مضبوطی کا باعث بنا ہے۔ سماج کے کردار ادب کے ذریعے سامنے بھی آتے ہیں اور ادیب کی فکر کو متاثر کرنے کا سبب بھی بنتے ہیں، یوں وہ تخلیقی عمل میں حصہ دار قرار پاتے ہیں۔

ادب اور سماج کے ربط باہم کے حوالے سے ایک زاویہ یہ بھی نمایاں ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سماج میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ادب کی وہی اصناف زندہ رہ پاتی ہیں جو ان تبدیلیوں کو اپنے دامن میں سموئے جاتی ہیں۔ جو اصناف سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو اپنے دامن میں جگہ دینے سے قاصر رہتی ہیں، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ معدوم ہوتی چلی جاتی ہیں۔اس کی ایک مثال ہم اردو داستان کے حوالے سے لے سکتے ہیں۔ایک وقت وہ تھا جب مافوق الفطرت عناصر کی سماج میں مقبولیت بھی تھی اور لوگ ان پر اعتماد بھی کرتے تھے۔ ماورائی مخلوقات پر سماج کے افراد کی کثیر تعداد یقین رکھتی تھی اور ان کے ذریعے

انسانی زندگی میں تغیر کی قائل تھیں۔ اس دور میں داستان ایسی صنف تھی جو ان مافوق الفطرت عناصر اور ماورائی اشیا کو اپنے دامن میں جگہ دیے ہوئے تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بیسوی صدی کے آغاز تک سماج میں ان مافوق الفطرت عناصر پر اعتماد موجود تھا اور اسی عہد تک ادب میں داستان کا چلن بھی عام رہا۔ کیوں کہ داستان ایسی صنف تھی جو ان سماجی اعتقاد کے حامل عناصر کو ادب کا حصہ بنانے پر قادر تھی۔ بیسویں صدی میں وقت کا دھارا تیزی سے بدلا۔ سائنسی ایجادات اور تیز ترین ٹیکنالوجی نے سماجی معیارات بدل دیے۔ مافوق الفطرت عناصر کو سائنس کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے جب سماج نے رد کر دیا یا ان پر اعتقاد کم ہوتا چلا گیا تو داستان جس کی بنیاد انھی سماجی عناصر پر تھی، اس پر بھی زوال آنا شروع ہو گیا۔ جوں جوں سماجی سطح پر جدید ترقی ہوتی گئی، داستان کی صنف جو اس سماجی ترقی کا ساتھ نہ دے سکی وہ معدوم ہوتی چلی گئی۔ اس کی بجائے ناول کی صنف سامنے آئی جو اس تیز ترقی اور جدید سماجی معیارات کا ساتھ دینے کی اہل تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادب سماج سے براہ راست متاثر ہوتا ہے۔ سماج کی پیش کش سے ہی ادب کا معیار بلند ہوتا ہے۔ اگر ادیب اپنے عہد کے سماجی منظر نامے اور بدلتے ہوئے سماجی معیارات کو ادب میں پیش کرنے سے قاصر رہتا ہے تو، اس کی ادبی تخلیقات کا معیار گرنے کا خدشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ادب، تاریخ اور سماج کا آپس میں ربط خاصا اہم ہے۔ یہ ایسا ربط ہے جو ان تینوں کی بقا کے لیے لازم ہے۔ اگر اس تعلق کا کوئی ایک زاویہ بھی معدوم یا کمزور ہو جائے تو دوسرے زاویے خود بخود متاثر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ تاریخ اور سماج، ادب کی تشکیل کے لیے ادیب کو مواد فراہم کرتے ہیں تو ادب ان کے اظہار کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ سماج ہر دم تغیر پذیر ہوتا ہے۔ یہ تغیر پذیری مختلف سماجی عناصر کی تعمیری اور تخریبی سرگرمیوں کی وجہ سے جاری رہتی ہے جس کی وجہ سے سماج میں ہر دم تبدیلیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو ادیب اپنے مشاہدے کے ذریعے قارئین تک پہنچاتا ہے اور ان کے اثرات سے یوں آگاہی دلاتا ہے کہ افرادِ معاشرہ نہ صرف حالات سے آگاہ ہو جاتے ہیں بلکہ وہ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے کے بھی قابل ہو جاتے ہیں۔ یہی ادب کا سب سے بڑا فریضہ ہے کہ وہ سماج کی نہ صرف عکاسی کرتا ہے بلکہ سماجی کمزوریوں، ناہمواریوں اور لغزشوں کو اس انداز سے سامنے لاتا ہے کہ مستقبل میں ان کے مضر اثرات سے بچنے کا رستہ بھی کھولتا ہے۔ اردو ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو کامیاب اور معیاری ادبی تخلیقات اس معیار پر پورا اترتی ہیں کہ ان میں تاریخ اور سماج کی عکاسی بھی ادبی شان کے ساتھ ہوتی ہے۔ قاری ایسی تخلیقات کے مطالعے سے نہ صرف ادبی ذوق کی تسکین کرتا ہے بلکہ اسے تاریخ اور اپنے سماجی منظر نامے سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ایسی ادبی تخلیقات جن میں

تاریخ اور سماج کی پیش کش ہو وہ نہ صرف ادبی حوالے سے اپنا معیار بڑھاتی ہیں بلکہ تاریخی اور سماجی حوالے سے بھی ان کی قدر و قیمت میں خاصا اضافہ ہوتا ہے۔

ب۔ اردو ناول میں تاریخی اور سماجی عناصر کا اجمالی جائزہ

ناول ادب کی ایک وسیع کینوس کی حامل ایسی صنف ہے جو اپنے دامن میں صدیوں کی تاریخ اور سماجی حالات کو سمونے کی وسعت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جس میں فکری و موضوعاتی حوالے سے خاصا تغیر واقع ہوا ہے۔ اردو ادب کی حد تک ہی دیکھا جائے تو بہت سے موضوعات ناول کی زینت بنے ہیں۔ ناول نگاروں نے زندگی کے متنوع رنگوں کو ناول میں سمو کر تاریخ اور سماج کو محفوظ کرنے کی سعی کی ہے۔

اردو ناول کی روایت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو میں ناول نگاری کا آغاز ہی سماجی مقاصد کے تحت ہوا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے عہد کے سماجی منظر نامے کی اصلاح کے جذبے کو مد نظر رکھتے ہوئے اردو ادب کو اس نئی صنف سے آشنا کیا۔ ان کے ناولوں میں سماجی اصلاح کا منصب تمام مقاصد پر غالب نظر آتا ہے۔ سماجی اصلاح کے لیے بھی انھوں نے عورت کو زیادہ موضوع بنایا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک عورت کی اصلاح ہی سماجی منظر نامے کو بہتر بنا سکتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد سماجی سطح پر جو شکست وریخت ہوئی اور جس طرح سماجی اقدار زوال پذیر ہونا شروع ہوئیں، اس میں ایسی ہی ایک صنف کی ضرورت تھی جو سماج کا مشاہدہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی اصلاح کا فریضہ بھی انجام دے۔ جب ہم ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے موضوعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس حقیقت سے آگاہی ہوتی ہے کہ ان کے تمام ناول ہی سماج کے کسی نہ کسی پہلو کی اصلاح کا جذبہ لیے سامنے آتے ہیں۔ مراۃ العروس میں بچیوں کی تعلیم و تربیت کو موضوع بناتے ہوئے سماجی اصلاح کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کی گئی ہے تو بنات النعش میں خانہ داری کی تربیت اور اخلاقی تعلیم کے حوالے سے بہت کچھ سامنے آتا ہے۔ توبتہ النصوح میں اولاد کی تربیت کو موضوع بناتے ہوئے انھیں مفید سماجی عنصر بنانے کی سعی ملتی ہے تو فسانہ مبتلا میں تعدد ازدواج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ابن الوقت تہذیبی تقلید کو موضوع بناتا ہے تو ایامیٰ میں بیوہ عورتوں کے نکاح کے حوالے سے فکری بلندی نظر آتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ناول کا آغاز ہی سماجی نقطہ نظر سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح رتن ناتھ سرشار کے ناولوں میں بھی ہمیں سماجی اور تہذیبی امور کا بیان بڑی صراحت سے ملتا ہے۔ ان کا مشہور ناول فسانہ آزاد اپنے دامن میں ایک پورا سماجی اور تہذیبی منظر نامہ

بسائے ہوئے ہے۔ایک مخصوص عہد کی تہذیب کو سامنے لاتا یہ ناول اردو ناول کی روایت کی اہم کڑی شمار ہوتا ہے۔

اردو ناول کے ابتدائی میں دور میں سماجی پیش کش کے ساتھ ساتھ تاریخی اہمیت کے ناول بھی سامنے آنے لگے۔ ناول نگاروں نے سماج کے ساتھ ساتھ تاریخ کو بھی موضوع بنایا۔اس سلسلے میں ہمیں بنیاد گزاروں میں ایک نام عبدالحلیم شرر کا ملتا ہے۔ شرر کو اردو کے تاریخی ناول نگاروں کا سرخیل قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔انھوں نے اپنے ناولوں میں تاریخی حقائق کو بڑی صراحت سے بیان کیا ہے۔ان کے بہت سے ناول ایسے ہیں جنہیں تاریخ کے تناظر میں کامیاب ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔فردوس بریں عبدالحلیم شرر کا ایک ایسا شہرۂ آفاق ناول ہے جس نے نہ صرف شرر کی شہرت اور مقبولیت میں اضافہ کیا بلکہ اردو ناول نگاری کی روایت میں ایک بہترین تاریخی ناول کا اضافہ بھی ثابت ہوا۔

مرزا ہادی رسوا اردو ناول نگاری کے بنیاد گزاروں میں شمار ہوتے ہیں۔انھوں نے جو ناول لکھے وہ بھی سماجی معاملات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔انھوں نے اپنے ناولوں میں طوائف کے کردار کے ذریعے سماج کی تہذیبی اور ثقافتی صورت حال کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔امراؤ جان ادا، ذات شریف، اختری بیگم اور افشائے راز ایسے ناول ہیں جو سماج کی کامیاب عکاسی قرار دیے جاسکتے ہیں۔ان ناولوں میں رسوا نے اپنے عہد کے سماجی منظر نامے کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔

سماجی عکاسی اور سماجی اصلاح کے تحت ناول لکھنے والوں میں ایک نام علامہ راشد الخیری کا بھی ہے۔ علامہ راشد الخیری کو حقیقی معنوں میں ڈپٹی نذیر احمد کا جانشین قرار دیا جاسکتا ہے۔انھوں نے سماج کے اہم عنصر عورت کے استحصال کو ناول کا موضوع بناتے ہوئے اس کے سماجی مرتبے کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔اسی طرح منشی پریم چند کی ناول نگاری کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے انھوں نے جس طرح سماج اور ادب کو قریب کیا اور سماجی حوالے سے بہترین ناول تحریر کیے،اس نے انھیں اردو ناول نگاری میں نمایاں مقام و مرتبہ کا حامل بنادیا۔ان کے ناول کامیاب سماجی ناول قرار پاتے ہیں۔ اسی عہد کے دیگر ناول نگاروں میں بھی سماجی اصلاح کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناول نگار، ناول کی سماجی اہمیت سے آگاہ تھے اور اس صنف کے ذریعے سماج کی اصلاح کرنے کی سعی کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ناول نگاری کے ابتدائی دور میں موضوعاتی حوالے سے ہمیں سماجی اور تاریخی موضوعات زیادہ غالب نظر آتے ہیں۔ایک طرف ڈپٹی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا اور ان کے دیگر بہت سے معاصرین سماجی اصلاح کو موضوع بنائے ہوئے تھے تو دوسری

طرف عبدالحلیم شرر اردو ناول کو تاریخ تک پھیلاتے ہوئے تاریخی ناولوں میں کامیابی حاصل کررہے تھے۔ گویا اردو ناول کا ابتدائی عہد سماجی اور تاریخی عکاسی کے حوالے سے خاص اہمیت کا حامل قرار پاتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ جب بیسویں صدی میں داخل ہوتی ہے تو یہ دور ناول کے ارتقائی سفر کا تھا۔ اس دور کی تاریخ اور سماج کا جائزہ لیا جائے تو ہندوستان پر اس وقت موجود نوآبادیاتی حکومت، ہندوستان کے سیاسی، ثقافتی اور سماجی نظام کو خاصی متاثر کررہی تھی۔ ایک طرف انگریزوں کے زیر اثر ہندوستان میں جاگیرداری کلچر پروان چڑھ رہا تھا۔ جاگیردار اپنی مراعات کی خاطر انگریزوں کے ہمنوا بن کر ان کی خواہشات کی تکمیل کے لیے کمربستہ رہتے تھے تو دوسری طرف سماجی سطح پر بھی مغربی سماجی اقدار رواج پارہی تھیں۔ رہی کسر اس تعلیمی نظام نے نکال دی تھی جو انگریزوں کے زیر اثر اس خطے پر لاگو کیا گیا اور آج تک کسی نہ کسی صورت میں چلا آرہا ہے۔ اردو ناول کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں نوآبادیاتی عہد کی تاریخ اور اس عہد کی سماجی اقدار کی پیش کش بڑی صراحت سے ملتی ہے۔ بہت سے ناول نگار ایسے ہیں جنھوں نے نوآبادیاتی عہد کو ہی موضوع بناتے ہوئے ناول تحریر کیے۔

سماجی حوالے سے دیکھیں تو اردو ناول کے ابتدائی دور میں ہی ہمیں نوآبادیاتی عہد میں پروان چڑھنے والے ان سماجی رویوں کی عکاسی ملتی ہے جو مغرب سے متاثر ہونے کی وجہ سے سامنے آئے تھے۔ ان میں دو طرح کے رویے تھے۔ ایک مغرب سے مرعوبیت کا رویہ تھا۔ جس میں ناول نگار مغرب کی چکاچوند اور چمک دمک سے متاثر ہونے والے سماج کی عکاسی کررہے تھے تو دوسری طرف ان مغربی سماجی اقدار کے خلاف مزاحمت کا رویہ بھی کسی نہ کسی صورت میں سامنے آتا ہے۔ بعض ناول نگار ایسے بھی ہیں جو مغربی تہذیب کو کسی حد تک قابل قبول سمجھنے کے ساتھ ساتھ اپنی مشرقی روایات کا احیا بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ ہندوستان کا مضبوط سماجی منظر نامہ تھا جس میں انگریزی تہذیبی اقدار نے تغیر پیدا کرنا شروع کردیا تھا۔ اس کی عکاسی ہمیں علامہ راشد الخیری کے ایک کردار کے ذریعے یوں ملتی ہے :

> میں نہیں چاہتی کہ لڑکیاں پرانی لکیر کی فقیر بنی رہیں۔ زمانہ کا رخ دیکھ کر کام کیا کرو۔ کون کہتا ہے کہ انگریزی جوتی پہننا حرام، مگر ہاں یہ میں کہتی ہوں اور کھلم کھلا کہتی ہوں کہ نماز کے وقت گراموفون سننا ناجائز۔[۵]

اس اقتباس کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انگریزی تہذیب اور انگریزی ایجادات کے زیر اثر ہندوستانی سماج بدل رہا تھا۔ یہ اقتباس حقیقت میں وہ اس سماج کی عکاسی کررہا ہے جس میں "ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر" کی سی صورت حال پیدا ہوچکی تھی۔

اردو ناول میں سماج کی پیش کش کے حوالے سے نمایاں کوشش اس وقت سامنے آتی ہے جب ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔اس تحریک کے زیر اثر اردو ناول پر وہ فضا جو رومانویت کی وجہ سے چھائی ہوئی تھی ، اس کو دور کرنے اور ناول کو سماج کا آئینہ ، ترجمان اور اصلاح کنندہ بنانے پر زور سامنے آنے لگا۔اس تحریک نے ناول اور دیگر افسانوی اصناف کو حقیقی معنوں میں سماج کے قریب کیا۔اس ضمن میں ابو بکر عباد اپنے ایک مضمون میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ترقی پسند تحریک نے اردو کے افسانوی ادب پر چھائی ہوئی رومانیت کے اثر کو ختم کیا اور ادب کو سماجی مسائل کے ادراک اور ان کے حل کا ذریعہ ، ہئیت اور آرائش کے بجائے مواد اور موضوع کی طرف زیادہ توجہ دی اور اسے سماج کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ بنایا۔[9]

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو ناول تحریر کیے گئے ان میں بہت سے کامیاب ناول ایسے ہیں جو سماج کی پیش کش کے بل بوتے پر کامیاب ہوئے۔ سجاد ظہیر کا لندن کی ایک رات، کرشن چند کا شکست، عزیز احمد کا گریز اور دیگر بہت سے ایسے ناول ہیں جن میں ہمیں اس عہد کا سماجی منظر نامہ واضح طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔یہ ترقی پسند ہی تھے جنھوں نے حقیقی معنوں میں ادب اور سماج کے تعلق کو پروان چڑھانے کے لیے شعوری کوشش کی۔ڈاکٹر محمد افضال بٹ اس ضمن میں لکھتے ہیں :

> اردو ناول میں سماجی شعور کی روایت کا تانا بانا اقتصادیات اور ترقی پسندوں سے ملتا ہے۔قدامت پسند اور کلاسیکی دور کے ادباء علامتیت اور نفسیات کی حد تک ادب میں سماجی شعور کو داخل کر دیتے تھے۔ جب کہ جدید ادب جس کا آغاز انیسویں صدی میں ہوتا ہے جس میں سماجی شعور ایک تحریک کی صورت میں رونما ہوتا ہے ، تغیرات زمانہ ، جغرافیائی تبدیلیوں ، جنگیں ، غربت ، افلاس ، بے روزگاری ، سماجی ناانصافی ایسی چیزیں ہیں جو اردو ناول میں سماجی شعور پیدا کرنے کا باعث بنیں۔[10]

اگر ہم ماضی کا جائزہ لیں تو ادب میں سماجی شعور کی پیدائش کے اسباب ہر دور میں انھی نکات سے ملتے جلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی طرف جائیں تو ترقی پسندوں نے بھی انھی کو بنیاد بناتے ہوئے ادب اور سماج کے رشتے کو مضبوط کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ نعرہ بلند کیا تھا کہ ادب کو سماج کے مظلوم ، بے بس اور غریب طبقے کی آواز بن کر انھیں ناانصافی ، بھوک اور ظلم و استحصال سے نجات دلانے کا باعث بننا چاہیے۔

تقسیم ہند بر صغیر کا ایسا واقعہ تھا جس نے ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا۔ایک ہنستا بستا سماج اچانک شکست

وریخت میں بدل گیااور جگہ جگہ تخریبی سرگرمیاں عروج کی طرف بڑھنے لگیں۔ اس عہد کی تاریخ کا مطالعہ کیاجائے تو یہ تاریخ سماج پر لگے خون کے دھبوں سے بھری ہوئی ملتی ہے۔ تقسیم کے دوران میں فسادات اور عزتوں کی پامالی جس طرح ہوئی وہ تاریخ کے ماتھے پر ایک بدنما دھبے کی صورت میں اب تک موجود ہے۔ تقسیم ہند کے بعد لکھنے والے اکثر ناول نگاروں نے اس اہم تاریخی واقعہ اور اس کے سماجی اثرات کو بڑے واضح انداز میں اپنے ناولوں میں بیان کیاہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض ناول نگاروں نے اس سانحے کے بیان میں جذباتی انداز بھی اختیار کیاہے لیکن زیادہ تر ناول نگاروں کے ہاں ہمیں اس تاریخی واقعے کی حقیقی تصویر کشی ملتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عابدہ نسیم لکھتی ہیں:

> ناولوں میں فسادات کے بیان پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ چند ایک ناولوں کو چھوڑ کر باقی تمام ناولوں میں فسادات کی حقیقی اور فن کارانہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چند ایک ناول ایسے ضرور ہو سکتے ہیں جن میں جذباتیت کا پہلو ذرا تیز ہو گیا ہے اور ناولوں میں واقعیت اور سطحیت پیدا ہو گئی ہے، تاہم اس کے برعکس اردو کے جتنے بھی نمائندہ ناول ہیں (جن کا موضوع تقسیم ہندوستان ہے) ان میں فسادات کا بیان غیر حقیقی اور غیر منطقی ہر گز نہیں ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ تقسیم ہند کے موقع پر انسانوں کو آگ اور خون کے ایسے ہی کرب ناک دریاؤں سے گزرنا پڑا۔[11]

تقسیم ہند کے بعد لکھے گئے ناولوں میں جو تاریخ اور سماج جھلکتا ہے اس کی کڑیاں نوآبادیاتی عہد کی تاریخ اور سماج سے ملتی ہیں۔ ناول نگاروں نے اس اہم تاریخی واقعے کو بیان کرتے ہوئے نوآبادیاتی عہد کی جو تاریخ ناولوں میں بیان کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم کے بعد لکھنے والے ناول نگاروں کا تاریخی اور سماجی شعور خاصا پختہ ہے۔ ان میں سے بہت سے ناول نگار ایسے بھی ہیں جنھوں نے ہجرت اور تقسیم کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے یہ تجربہ جھیلا بھی تھا۔ قرۃ العین حیدر کا شمار ایسے ہی ناول نگاروں میں ہوتا ہے جن کے ہاں ہمیں اس تاریخی واقعے اور اس کے سماجی اثرات کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کا ناول میرے بھی صنم خانے اس عہد کی تاریخ اور سماج سے آگاہی دلاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں ایک طرف نوآبادیاتی عہد کی تاریخ کی جھلکیاں دکھائی ہیں تو دوسری طرف یہ ناول تقسیم کے بعد کے اس سماجی دکھ کو سامنے لاتا ہے جس میں مبتلا لوگوں کو مشترکہ تہذیبی اور سماجی ورثے کے تین ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ شیبا عالم لکھتی ہیں:

قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں براہِ راست فسادات اور قیام پاکستان کے عمل
کے سیاسی مضمرات کو براہِ راست موضوع نہیں بنایا۔ اس میں ہندوستان کی ایک
زوال شدہ تہذیب کی راکھ سے ایک نئی تہذیب کے جنم کو موضوع بنایا گیا ہے۔[12]

یوں یہ ناول تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد کی تہذیبی اور سماجی صورت حال میں ہونے والی تبدیلی کو سامنے لاتا ہے۔ اسی طرح ان کا ایک اور ناول سفینۂ غمِ دل تقسیم کے بعد کے حالات اور سماج کا نقشہ پوری طرح کھینچتا ہے۔ اسی دوران میں ان کا معروف شہرۂ آفاق ناول آگ کا دریا ۱۹۵۹ء میں سامنے آیا۔ اس ناول میں انھوں نے جس طرح صدیوں پر پھیلی ہوئی تاریخ کو ناول کے دامن میں سمویا ہے وہ اردو ناول میں تاریخ کی عکاسی کا ایک ایسا تجربہ ثابت ہوا ہے، جس کی مثال اردو ناول میں نہیں ملتی۔ ممتاز احمد خان اس ناول میں تاریخ کی عکاسی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

آگ کا دریا کی ڈھائی ہزار سال کی تاریخ میں ظہور پذیر ہونے والی روداد پوری کی
پوری انسانی زندگی پر وقت کی یلغار کو پیش کرتی ہے اور چند نئے حقائق کو بھی
منکشف کرتی ہے۔[13]

قرۃ العین حیدر کے ہاں تاریخی حسیت ان کے بعد کے کئی ناولوں میں بھی ملتی ہے۔ آخر شب کے ہم سفر ایک ایسا ناول ہے جو ہمیں تاریخ میں سفر کراتے ہوئے تقسیم بنگال اور اس تقسیم کے خلاف ہونے والی مزاحمت اور اس کے سماجی اثرات تک لے جاتا ہے۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس ناول میں نوآبادیاتی عہد کے سماجی حالات اور خاص طور پر مذہبی سطح پر ہونے والی تبدیلی کو بھی نمایاں کیا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتی ہیں:

ان مشنریوں نے کالے مبلغ اور پادری تیار کیے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد عیسائیت کو
حکومت کا مکمل تعاون حاصل ہو چکا تھا (انگریزوں کا عبادت خانہ، گرجا۔ بے
چارے مسلمان جل کر کہتے تھے) کالا پادری چوراہوں اور سڑکوں پر تبلیغ کرتا
پھر رہا تھا اور مولویوں سے مناظر کر رہا تھا۔[14]

قرۃ العین حیدر کے ناول اس طرح کے تاریخی اور سماجی حالات کی عکاسی سے بھرے پڑے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں تاریخ اور سماج کو بیان کرتے ہوئے حقائق سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

نوآبادیاتی عہد اور تقسیم کے بعد کے تاریخی اور سماجی حالات کی عکاسی کے حوالے سے ایک اہم ناول نگار عبداللہ حسین بھی سامنے آتے ہیں۔ عبداللہ حسین کا ناول اداس نسلیں اپنے دامن میں نوآبادیاتی کی پوری تاریخ اور سماج لیے ہوئے ہے۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی تاریخ اور مغربی تہذیب

کے زیر اثر ہندوستان کے سماج میں آنے والی تبدیلیوں کی عکاسی ہمیں اس ناول میں ملتی ہے۔ عبداللہ حسین نے بڑی مہارت سے اس ناول میں ہندوستان پر نوآبادیاتی حکومت کی ان پالیسیوں کا جائزہ پیش کیا ہے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستان کے سماج کو متاثر کیا۔ جاگیرداروں کے ذریعے عوام کو اپنا ہمنوا بنانا اور بدلے میں جاگیرداروں کو مراعات سے بھی نوازنا اور کمزور طبقے کے استحصال کی کھلم کھلا اجازت دینا ایسی استعماری پالیسیاں تھیں جنھوں نے ہندوستان کے سماج کو خاصا متاثر کیا۔ عبداللہ حسین کا یہ ناول اس منظر نامے کی خوب عکاسی کرتا ہے۔

تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ناول ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی تاریخ کا بڑی صراحت سے احاطہ کرتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کی طرف سے ہندوستانیوں کا استحصال، کانگریس کا قیام، بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں سیاسی بیداری، مسلم لیگ کا قیام، پہلی جنگ عظیم، سانحہ جلیانوالہ باغ، تحریک آزادی کا عروج اور بالآخر تقسیم ہند اور پھر فسادات ایک پورا تاریخی تناظر ہے جو اس ناول میں سمویا گیا ہے۔

نوآبادیاتی عہد کی تفہیم و تعبیر اور اس عہد کی تاریخ کو خدیجہ مستور نے اپنے ناول آنگن میں بھی بڑی صراحت سے بیان کیا ہے۔ آنگن ایسا ناول ہے جو نوآبادیاتی عہد کے مختلف واقعات کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سماج کا بھی بہترین نقشہ کھینچتا نظر آتا ہے۔ اس ناول میں نوآبادیاتی عہد کی مختلف پالیسیوں کے ساتھ ساتھ تحریک خلافت، تحریک آزادی ہند، تقسیم ہند اور دیگر بہت سے تاریخی واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ ان واقعات کے سماجی اثرات کا بیان اس ناول کے سماجی مقام و مرتبے کو بڑھانے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

تقسیم ہند اور اس کے بعد کے سماجی اثرات کے حوالے سے خدیجہ مستور کا ناول زمین بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں انھوں نے تقسیم ہند کے بعد کے حالات کو موضوع بناتے ہوئے اس دور میں سماجی اقدار کے زوال کو بھی نمایاں کیا ہے۔ یوں یہ ناول ایک طرف تاریخ کے اہم سانحے سے روشناس کرتا ہے تو دوسری طرف سماجی سطح پر نوزائیدہ مملکت کے سماج کی کئی زاویوں سے تعبیر بھی کرتا ہے۔ لوٹ کا مال سمجھتے ہوئے جعلی کلیم داخل کروا کے جائیدادیں ہتھیانے والوں کی قلعی اس ناول میں خوب کھولی گئی ہے۔ تقسیم ہند کے بعد کی تاریخ اور سماجی صورت حال کی عکاسی کے حوالے سے یہ ناول ایک اہم دستاویز قرار پاتا ہے جس میں مصنفہ نے بڑی عرق ریزی سے مختلف تاریخی واقعات اور سماجی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد کی تاریخی اور سماجی حالات کی عکاسی کے حوالے سے عبداللہ حسین کا ناول نادار لوگ ایک اہم ناول قرار پاتا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے بیسویں صدی کے آخر تک کی پاکستانی تاریخ

اور سماجی منظر کو سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ ناول اس عہد کی تاریخ کا ایک مکمل بیانیہ بن کر سامنے آتا ہے۔ نوزائیدہ مملکت کے مسائل، تقسیم کے بعد جعلی لاٹمنٹ کے سلسلے، آگے چل کر مارشل لا اور اس کے اثرات سے متاثر ہوتا ہوا سماج، ذوالفقار علی بھٹو اور پیپلز پارٹی کا عروج وزوال ایسے تاریخی واقعات ہیں جو اس ناول کے ذریعے وہ قارئین کے سامنے لائے ہیں۔ سماجی حوالے سے دیکھیں تو اداس نسلیں میں جاگیرداری نظام کی عکاسی کی گئی تھی تو اس ناول میں عبداللہ حسین جاگیرداری کو سرمایہ کاری میں بدلتے ہوئے سامنے لاتے ہیں۔ ایک سرمایہ کار کس طرح اپنے سرمائے میں اضافے کے لیے اپنے مزدوروں کا استحصال کرتا ہے اور اس استحصال سے سماج کس طرح متاثر ہوتا ہے، یہ ناول اس کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول میں عبداللہ حسین کے تاریخی شعور اور اس میں بیان کی گئی تاریخی حسیت پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہد نواز لکھتے ہیں:

> نادار لوگ وسیع کینوس پر پھیلا ہوا عصریت سے بھرپور ناول ہے۔ فسادات ہوں یا الاٹمنٹ کے مسائل، ملک میں سیاسی نظام کا سفر ہو یا پھر مارشل لا کا نفاذ، جنرل ایوب کی مختلف اصلاحات ہوں یا ان کے خلاف ردعمل، ۶۵ء کی پاک بھارت جنگ ہو یا جنگ کے بعد ملک میں تبدیلی کی کروٹیں، سیاسی وسماجی تنظیموں کی سرگرمیاں ہوں یا ملک میں نئے لیڈر اور یا پارٹی کا ظہور، ۷۰ء کے انتخابات ہوں یا پھر سقوطِ ڈھاکہ، نئے جمہوری دور کا آغاز ہو یا جمہوریت کے نام پر جبر وتشدد، ملک میں فوجی اداروں کی اجارہ داری ہو یا فوجی سربراہوں کی یک رخی، مذہبی طبقے کی نام نہاد نفاذِ اسلام کی کوشش ہو یا خفیہ اداروں کی اپنے حقوق کے لیے لڑنے والوں پر جسمانی وذہنی تشدد کی داستان سب کچھ اس ناول کا حصہ ہے۔[۱۵]

عبداللہ حسین کا یہ ناول اپنے دامن میں اپنے عہد کی تاریخی اور سماجی رویوں کو بڑے احسن انداز میں سموئے ہوئے۔ عبداللہ حسین نے نہ صرف پاکستان کی تاریخ کو اس ناول میں بیان کیا بلکہ انھوں نے پاکستانی سماج میں سال بہ سال ہونے والی تبدیلیاں بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ جاگیردارانہ نظام سے جب سرمایہ داری نظام میں سماج ڈھلتا ہے تو اس کے تقاضے بھی بدلتے چلے جاتے ہیں۔ معاشی نظام کے بدلنے سے رہن سہن میں بھی تبدیلی واقع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ عبداللہ حسین نے اس ناول میں اس بدلتے ہوئے سماجی منظر نامے کی بھرپور عکاسی کی ہے جس کی وجہ سے یہ ناول پاکستان کی تاریخ اور سماج کا ایک حقیقی آئینہ بن کر سامنے آیا ہے۔

پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس مملکت کو شروع ہی سے بہت سے مسائل کو سامنا کرنا پڑا۔ سیاسی سطح پر ہونے والی چالبازیوں اور مفاد پرستی نے اس ملک کے سیاسی نظام کو شروع ہی سے کمزور کیے رکھا۔ سیاسی نظام کی اس کمزوری سے ہمیں مارشل لا کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس کے ساتھ ساتھ دو خطوں میں تقسیم اس ملک کے دونوں بازوؤں میں بھی پائیدار اور مستحکم تعلقات استوار نہ ہو سکے۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو اپنی محرومیوں کا احساس بڑھنے لگا تو اس کے نتائج سقوطِ ڈھاکہ کی صورت میں سامنے آئے۔ سقوطِ ڈھاکہ پاکستان کی تاریخ کا ایسا واقعہ ہے جس پر آج بھی ہر محب وطن پاکستانی خون کے آنسو روتا ہے۔ اس واقعے نے سماج کے دیگر طبقات کے ساتھ ساتھ ادیبوں کو بھی خاص طور پر متاثر کیا۔ اردو ادب خاص طور پر ناول میں تاریخ کے اس واقعے کو بیان کرنے میں ناول نگاروں نے کسی تساہل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو میں بے شمار ایسے ناول سامنے آئے جن میں سقوطِ ڈھاکہ اور اس کے سماجی اثرات کی عکاسی ملتی ہے۔ ایسے ناولوں میں اللہ میگھ دے ، ایک کشتی ملاح سے خالی ، چلتا مسافر ، صدیوں کی زنجیر ، تنہا اور خلیج ایسے ناول ہیں جو کلی طور پر اس تاریخی واقعے کو بنیاد بنا کر لکھے گئے۔ جب کہ بعض ناول ایسے بھی ہیں جن میں اس سانحے کو ناول نگاروں نے پاکستان کی عصری تاریخ بیان کرتے ہوئے دیگر موضوعات کے ساتھ بطورِ خاص موضوع بنایا ہے۔ ایسے ناولوں میں نادار لوگ، راکھ ، مٹی آدم کھاتی ہے ، بستی ، خوشیوں کا باغ اور جنم روپ شامل ہیں۔ ان ناولوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ اردو ناول نے پاکستان کی تاریخ کا حقیقی چہرہ دکھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ناول نگاروں نے نہ صرف سقوط ڈھاکہ کے سیاسی و عسکری معاملات کو ناولوں میں بیان کیا ہے بلکہ اس سانحے کے سماج پر پڑنے والے اثرات اور دونوں خطوں کے لوگوں کے رویوں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول پاکستان کی تاریخ کے اُس عہد کی تاریخ کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سماج کا مظہر بن کر بھی سامنے آتے ہیں۔

سقوطِ ڈھاکہ کے بعد پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اہم واقعہ جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء سامنے آتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں کئی مارشل لا لگے ، لیکن جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا نے پاکستانی سماج کو جس طرح متاثر کیا، ایسا کسی دوسرے عہد میں نہیں ملتا۔ ایک طرف جمہوریت پر شب خون مار کر مقبول عوامی لیڈر کو پہلے قید کیا گیا اور بعد ازاں ایک متنازعہ عدالتی فیصلے کے تحت پھانسی چڑھا دیا گیا تو دوسری طرف اپنے اقتدار کو طول دینے اور مستحکم اقتدار حاصل کرنے کی غرض سے اہلِ اقتدار نے اسلامی نظام کا ڈول ڈالا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام پوری طرح نافذ نہ کیا جا سکا۔ دوسرے لفظوں میں یہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ، اسلام کو بھی اقتدار کی خاطر استعمال کیا گیا اور اس سے اتنا ہی کام لیا گیا جتنا اقتدار کے لیے ضروری تھا۔ اس مارشل لا نے

پاکستانی تاریخ اور سیاست کے ساتھ ساتھ پاکستانی سماج کو بھی خاصا متاثر کیا۔ اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افرادِ معاشرہ پر پڑے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ادب میں بھی اس کی عکاسی بھرپور انداز سے کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ناول کا مطالعہ کیا جائے تو عبداللہ حسین کا ناول قید اسی دور کی سیاسی و سماجی تاریخ سامنے لاتا ہے۔ یہ ایک ایسا ناول ہے جس میں ضیاء الحق کے مارشل لا اور اس کے نتیجے میں سماج میں پروان چڑھنے والی پیری فقیری کی روش اور لوگوں کے اس پر اندھے اعتقاد کی حقیقت کو عیاں کیا گیا ہے۔

ضیاء الحق دور کی تاریخ میں افغان جہاد بھی تاریخ کا ایک اہم واقعہ بن کر سامنے آتا ہے۔ روس جسے گرم پانیوں تک رسائی کی ضرورت تھی، افغانستان میں اپنے اپنا قبضہ مستحکم کیے جا رہا تھا جو ظاہر ہے ایک ابھرتی ہوئی عالمی طاقت امریکہ کے لیے کسی طور پر بھی قابل قبول نہ تھا۔ یوں امریکہ نے پاکستان کے ذریعے افغانستان کے عوام کو روس کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے پر آمادہ کر لیا۔ افغانستان کی آزادی کے لیے جہاد کا نعرہ بلند کیا گیا جس میں افغان عوام کو اسلحہ اور ڈالروں کے ساتھ پاکستان کو بھی نوازا گیا۔ اس جہاد نے ایک طرف روس کو شکست فاش دی اور اسے اپنا وجود قائم رکھنا مشکل ہو گیا تو دوسری طرف پاکستان کے تاریخی اور سماجی منظر نامے میں بھی خاصی تبدیلی واقع ہوئی۔ یہ بات بھی درست ہے کہ اس جنگ کی وجہ سے پاکستان کو جس طرح نوازا گیا وہ ہماری معاشی حالت کے سدھارنے میں اہم ہے لیکن اس معاشی سدھار کے بدلے میں یہ خطہ حربی تجربوں کا میدان بھی بن گیا۔ اس وقت کی لگی ہوئی آگ آج بھی کسی نہ کسی صورت میں جل رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان میں افیون اور کلاشنکوف کلچر اسی عہد کی دین ہے۔ جہاد کا یہ نعرہ باقاعدہ سرکاری سرپرستی میں بلند کیا گیا اور اس کی تبلیغ شہر شہر اور گاؤں گاؤں ہونے لگی تھی۔ اس سے سماجی سطح پر بھی ایک نیا رویہ سامنے آیا۔ لوگوں کی سوچ میں آنے والی تبدیلی کے بارے میں بات کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہد نواز لکھتے ہیں:

> ہمارے مذہبی رہنما دیہاتوں اور قصبوں میں جہاد کی تبلیغ اتنے موثر انداز میں کر رہے تھے، کہ لوگ اپنی اولاد کو جہاد کے لیے خود بھیجنے پر تیار ہو گئے تھے۔ نوجوانوں کو جنت اور ظاہری طاقت کے ایسے قصے سنائے جا رہے تھے، کہ وہ ہر چیز کو چھوڑ چھاڑ کر ان جہادی کیمپوں میں جانے لگے۔ ریاست ان کیمپوں میں آنے والوں کو تربیت فراہم کر رہی تھی۔ خفیہ ادارے امریکہ کے کہنے پر افغانستان کی جنگی حکمتِ عملیاں ترتیب دے رہے تھے۔[۱۶]

اردو ناول نگاروں نے عہدِ ضیاء الحق کے اس اہم تاریخی واقعے کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ناول نگاروں نے اس واقعہ اس کے سماجی اثرات کو کھل کر ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے جو ناول

آتے ہیں ان میں صدیق سالک کا ایمرجنسی اور مستنصر حسین تارڑ کا قلعہ جنگی خاص اہمیت کے حامل ناول ہیں۔ ان ناولوں میں افغان جہاد اور اس کے سماجی اثرات کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔ اس جہاد میں عام دیہاتیوں کے بچوں کو مجاہدین بنا کر بھیجا گیا اور بدلے میں جو ڈالر اکٹھے کیے گئے ان سے عام آدمی کو کم جب کہ اہل اقتدار کو زیادہ فائدہ حاصل ہوا۔ اس سے سماجی سطح پر پائی جانے والی تفریق بھی نمایاں ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ فائدہ ان فوجی افسران نے حاصل کیا جو اس سے جہاد سے وابستہ تھے۔ یہ فائدہ اس بیرونی اسلحے کی صورت میں تھا جو ان افسران نے اکٹھا کیا اور پھر اس کے بل بوتے پر اپنی امارت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ جب کہ عام آدمی محض لڑنے مرنے تک ہی محدود تھا۔ مستنصر حسین تارڑ قلعہ جنگی اس سماجی تفاوت کی قلعی یوں کھولتے ہیں:

> مرتضیٰ بیگ کے مجاہد باپ کے ہاتھوں میں بھی کچھ سٹنگرز آئے۔ جن میں کچھ آگے گئے اور کچھ پیچھے اس کے پاس رہ گئے۔ سٹنگر کو بیچنے سے دو تین فیکٹریاں خریدی جاسکتی تھیں۔ کرنل ارتضیٰ بیگ ریٹائرمنٹ کے بعد نہ صرف ملکی سیاست میں معزز ٹھہرے بلکہ انھوں نے اس عظیم جہاد کے ثمرات کو ایک انڈسٹریل ایمپائر میں بدل دیا اور ایک آسائشی زندگی کی لطف اندوزی میں شب و روز بسر کرنے لگے۔[17]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بیسویں صدی کے برصغیر کی تاریخ خاصی ہنگامہ خیز تاریخ ہے۔ اس میں سیاسی و سماجی دونوں حوالوں سے خاصا تحرک رہا ہے۔ اردو ناول کے آغاز سے لے کر بیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے برصغیر جن حالات سے گزران میں بہت سے ایسے واقعات ہیں جو تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ اس خطے کی کوئی بھی تاریخ ان واقعات کا تذکرہ کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ کانگریس کا قیام، مسلم لیگ کا قیام، پہلی جنگ عظیم، سانحہ جلیانوالہ باغ، انقلاب روس، تحریکِ آزادی، تقسیم ہند، ہجرت کے واقعات، نوزائیدہ مملکت میں آبادکاری، بار بار مارشل لا کا آنا اور کمزور جمہوری حکومتیں، بھٹو کا سیاسی عروج اور پیپلز پارٹی کا قیام، سقوطِ ڈھاکہ، افغان جہاد وہ تاریخی واقعات ہیں جن کے اثرات سماج پر خاصی گہری طرح مرتب ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی معاشی دنیا میں پہلے جاگیردارانہ نظام اور پھر سرمایہ دارانہ نظام نے سماجی طبقات کو خاصا متاثر اور کسی حد تک مضطرب بھی کیا۔ اردو ناول نگاروں نے تمام سیاسی، سماجی حالات اور تاریخ کو ناول کا حصہ بنانے کی شعوری کوشش کرتے ہوئے ادب میں برصغیر کی تاریخ اور سماج کو محفوظ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ سماج کی اصلاح کے جذبے سے اردو میں شروع ہونے والی اس نمایاں افسانوی صنف نے اپنے ارتقائی سفر

کے دوران میں اپنے وسیع کینوس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بر صغیر کی تاریخ کو محفوظ کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔

بیسویں صدی میں سیاسی اور تاریخی واقعات کے اثرات کی وجہ سے سماجی سطح پر جو تغیر سامنے آتا رہا اور بدلتے ہوئے سماجی حالات میں عوام کی زندگی جس ڈگر پر چلتی رہیں، اردو ناولوں میں اس کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ نذیر احمد سے لے کر پریم چند تک اور پھر آگے بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کے سنگم تک سامنے آنے والے ناولوں میں سماج کے کسی نہ کسی پہلو کو بھرپور انداز میں نمایاں کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اردو ناول تاریخ اور سماج کی عکاسی کے حوالے سے خاصا وسیع دامن واقع ہوا ہے۔ ناول نگاروں نے نہ صرف عصری تاریخ اور سماجی حالات کو ناول کا موضوع بنایا ہے بلکہ بہت سے ناول نگار ایسے بھی ہیں جو ماضی کی طرف سفر کرتے ہوئے ماضی کی تاریخ اور سماجی منظر نامے کو ناول میں بیان کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس سے ناول میں تاریخ اور سماج کی پیش کش کے ساتھ ساتھ ادب اور تاریخ کا رشتہ بھی مضبوط ہوا۔ ناول ایک ایسی صنف بن کر ابھرا جس میں متنوع موضوعات اور مختلف ادوار کی تاریخ اور سماج کو کامیابی سے پیش کیا جاسکتا ہے۔

ج۔ معاصر اردو ناولوں میں تاریخ و سماج کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

اکیسویں صدی کا آغاز پاکستان اور دنیا بھر میں خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ بیسویں صدی کے آخر میں امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی نے نہ صرف امریکہ کی معیشت اور سماج کو متاثر کیا تھا بلکہ دنیا بھر کے حالات میں تبدیلی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوئی۔ اس تباہی سے شروع ہونے والی جنگ نے ایک طرف افغانستان میں طالبان کی حکومت ختم کی تو دوسری طرف بر صغیر کے خطے میں امریکہ کے ایک بار پھر آنے کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس جنگ کے اثرات کے تحت ایسی دہشت گردی اور تباہی شروع ہوئی جس سے پاکستان کے بچے تک محفوظ نہ رہے۔ عالمی سطح پر دیکھا جائے تو بڑھتی ہوئی مہنگائی، کساد بازاری، معاشی تباہی اور دیگر بہت سے ایسے عفریت سامنے آئے جنھوں نے مختلف ممالک کے سماجی منظر نامے کو متاثر کیا۔ مبین مرزا اس عہد کی سماجی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> یہ عہد اپنی نہاد میں ماقبل تاریخ کے تمام ادوار سے یکسر مختلف ہے۔ اس کا ایک اہم سبب وہ نظریات و تصورات بھی ہیں جنھوں نے اس کی صورت گری کی ہے اور ان کے ساتھ انسانی مزاج، رویوں اور اقدامات میں ظاہر ہونے والی تشکیلات

بھی۔ یہ سب کچھ اس درجہ گنجلک یا تہ دار ہے کہ اسے کسی ایک رخ سے پوری طرح سمجھنا اور گرفت کرنا تو رہا الگ، اس کی محض نوعیت کا اندازہ بھی پوری طرح نہیں کیا جا سکتا۔[۱۸]

ادبی حوالے سے دیکھا جائے تو اکیسویں صدی میں دیگر اصناف ادب کے ساتھ ساتھ ناول کے ارتقا کا سفر بھی جاری ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اب تک بے شمار ایسے ناول لکھے جا چکے ہیں جن میں عصری اور ماضی کی تاریخ اور سماجی صورت کی عکاسی بڑے احسن انداز میں کی گئی ہے۔ اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے ناولوں میں عصری تاریخ کو ناول نگاروں نے حقیقت پسندانہ انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسی تاریخ ہے جو ناول نگاروں کے مشاہدے کا حصہ بنی ہے۔ ناول نگاروں نے اس زندگی کو خود جیا ہے اور اس سماج کی مختلف اقدار کو خود پر برتا ہے جس کی وجہ سے معاصر ناول نگاروں میں تاریخ کا بیان زیادہ حقیقت پسندانہ انداز میں سامنے آیا ہے۔

اردو ناول میں تاریخ اور سماج کی پیش کش کے حوالے سے اکیسویں صدی میں شائع ہونے والے ناولوں میں حسن منظر کا ناول العاصفہ ایک اہم ناول ہے۔ العاصفہ کا شمار ایسے ناولوں میں ہوتا ہے جو جدید عہد کے ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ایک مخصوص خطے کی تاریخ اور ماضی کی روایات اور اقدار بھی لیے ہوئے ہیں۔ یہ ایسا ناول ہے جو عرب کی سرزمین کو موضوع بناتا ہے۔ اس ناول کے نام سے ہی اس تبدیلی سے آگاہی ہوتی ہے جو عرب کے خطے کی سرزمین پر واقع ہونے جا رہی تھی۔ عرب کی سرزمین سے تیل کی دریافت کے بعد یہ خطہ دنیا بھر کے ممالک کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث بنا ہے۔ اس دلچسپی کی وجہ امریکہ اور دیگر ممالک کی تیل کی کمپنیوں کے مالی مفادات ہیں جو یہاں سے پورے ہوتے ہیں۔ ان مفادات کے ساتھ ساتھ تیل کی دریافت نے اس خطے کی سماجی زندگی پر جو اثرات مرتب کیے ہیں، حسن منظر کا ناول اس کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول میں کہانی کی صورت میں بیان کیے گئے حقائق عرب کی سرزمین کا حقیقی نقشہ سامنے لاتی ہے۔ یہ ناول ہمیں عرب کی سماجی صورت حال اور تاریخ سے بھی روشناس کراتا ہے۔ اکیسویں صدی کے ناولوں میں تاریخ اور سماج کے مطالعے کے حوالے سے العاصفہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اکیسویں صدی کی ناول نگاری میں مستنصر حسین تارڑ کا نام ایک ایسے ناول نگار کے طور پر سامنے آتا ہے جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے جدید عہد کے حالات اور سماج کا تجزیہ انتہائی غیر جانبداری سے کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اگرچہ مختلف اصناف ادب میں کمال رکھتے ہیں تاہم انھیں سفر نامے کے علاوہ سب سے زیادہ مقبولیت ناول نگاری کے میدان میں حاصل ہوئی۔ اکیسویں صدی میں ان کے جو ناول سامنے آئے

ہیں وہ سب کسی نہ کسی اہم سماجی حقیقت کو آشنا کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ جدید عہد کے کامیاب سفر نامہ نگار بھی ہیں۔ انھوں نے جو سفر نامے تحریر کیے ہیں ان کے لیے کیے جانے والے اسفار نے دنیا کے مختلف ممالک کے سماج کو قریب سے سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ یوں سماج ان کے مشاہدے کا حصہ بنتا چلا گیا ہے۔ جب یہی سماج ناول کے صفحات پر سامنے آتا ہے تو اس میں حقیقت نگاری کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

قلعہ جنگی مستنصر حسین تارڑ کا ایک ایسا ناول ہے جس میں انھوں نے امریکہ افغان جنگ کا نقشہ بڑی تفصیل سے کھینچا ہے۔ اس ناول میں وہ تاریخ میں سفر کرتے ہوئے بعض ایسے واقعات کو بھی سامنے لائے ہیں جو روس کے خلاف افغان جہاد کے وقت سامنے آئے تھے۔ ناول نگار کے مطالعے اور مشاہدے نے اس عہد کے مختلف سیاسی و سماجی حالات کو ناول میں سمو کر محفوظ کر دیا ہے۔ قلعہ جنگی کے مقام امریکی بمباروں کی بمباری اور اس کے نتیجے میں لوگوں کو قتل اور پھر سماج میں اس جنگ سے پھیلنے والی دہشت اس ناول میں اہم موضوع بن کر سامنے آتا ہے۔

اکیسویں صدی میں تاریخ کے مطالعے کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کا ناول اے غزال شب ایک ایسا ناول ہے جو ہمیں تاریخ کے اس عہد سے روشناس کراتا ہے جس میں اشتراکیت کا علم بلند ہوا۔ اس ناول میں روس کے اشتراکی انقلاب کو موضوع بناتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ نے اس سماجی منظر نامے کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس میں آئیڈیلزم کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ روس میں آنے والے اشتراکی انقلاب نے پوری دنیا کے مظلوم اور متوسط طبقے کو روس کی راہ دکھائی۔ اس ناول کے کرداروں کی طرح بہت سے لوگ ایسے تھے جو اشتراکیت کی بقا اور اپنے حقوق کی امید میں ترک سکونت کر کے روس میں پہنچے اور وہاں آباد ہوئے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اشتراکیت کو زوال آیا اور اس کی جگہ سرمایہ داری نے لے لی تو روس میں ان لوگوں کو قابل نفرت قرار دیا گیا۔ یہ ایسے لوگ تھے جو اپنے سماج سے ترک سکونت کر کے اشتراکی سلطنت میں رہائش پذیر ہو گئے تھے، لیکن اشتراکیت کے زوال کے ساتھ ہی اس سلطنت نے ان کو اجنبی قرار دے دیا۔ اس سماج جس کی بقا کے لیے ان لوگوں نے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں، اس میں ان کی حیثیت ایک ایسے فرد کی سی ہو گئی تھی جس کی کوئی سماجی پہچان ہی نہ تھی۔ تاریخ کے اہم واقعہ انقلاب روس اور پھر اس کے سماجی اثرات سے آگاہی کی وجہ سے اس ناول کو بھی ایسے اردو ناولوں میں شمار کیا جا سکتا ہے جو تاریخ اور سماج کی پیش کش کے حوالے سے اہم ناول قرار پاتے ہیں۔

معاصر اردو ناولوں میں عصری تاریخ کی پیش کش کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کا ناول خس وخاشاک زمانے بھی اہم ناول ہے۔ اس ناول میں انھوں نے پس منظر کے طور پر برصغیر کی تاریخ کے مختلف واقعات خاص طور پر تقسیم ہند کے وقت ہجرت کے دوران میں ہونے والی قتل وغارت اور عزتوں کی پامالی کو موضوع بنایا ہے تو آگے چل کر جدید عہد کے اہم واقعہ یعنی نائن الیون کی عکاسی بھی بھرپور انداز میں کی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا سماجی مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ وہ سماج کے رمز شناس بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں ہمیں تاریخ اور سماج کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ جس عہد کی تاریخ یا جس تاریخی واقعے کو بیان کرنے کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس کے سماجی اثرات کو بھی مد نظر رکھتے ہیں۔ یوں کے ان ناولوں میں بہت سے تاریخی حقائق دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خس وخاشاک زمانے میں بھی انھوں نے ایک پورے عہد کی تاریخ بیان کی ہے۔ یہ ایسا عہد ہے قیام پاکستان کے بعد شروع ہوتا ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے سماجی مسائل کم یا ختم ہونے کی بجائے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ امجد طفیل اس ناول میں تاریخ اور سماج کی عکاسی پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> خس وخاشاک زمانے کی ابتدا ۱۹۲۰ء کی دہائی کے دیہاتی پنجاب، خاص طور پر دریائے چناب کے گرد پھیلے گجرات، گوجرانوالہ کے دیہات سے ہوتی ہے، جس میں جاٹ معاشرے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جس میں ذات برادری سب سے اہم تھی۔ سکھ اور مسلمان جاٹ آپس میں خاندان کے فرد کی طرح ملتے تھے۔[۱۹]

ہم عصر اردو ناول میں عصری تاریخ کے حوالے سے انیس ناگی کا ناول ۳۱۳ بریگیڈ بھی نمایاں ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے نائن الیون کے واقعے کو بنیاد بنا کر ایک ایسی کہانی تخلیق کی ہے جس سے اس واقعے کے بعد بدلتی ہوئی سماجی زندگی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ دہشت گردی کی جو اصطلاح اس عہد میں رائج ہوئی، اس ناول کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے ہر کوئی اپنے مفادات کی خاطر من پسند معنی پہنائے جا رہا ہے۔ انیس ناگی نے اس ناول میں نائن الیون کے بعد دہشت گردی کے پھیلتے ہوئے عفریت اور اس کے سماجی اثرات کو واضح کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے میں ان کا ایک ناول پتلیاں بھی اہم قرار پاتا ہے۔ اس ناول میں انھوں ان سیاست دانوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جو دوسروں کے اشاروں پر ناچتے ہیں اور ان کا مقصد صرف اور صرف اقتدار کا حصول ہوتا ہے۔ ایسے نام نہاد سیاست دانوں کی کارستانیوں کی وجہ سے سماج پر پڑنے والے مضر اثرات اور ان کے نتیجے میں زوال کی طرف بڑھتا ہوا سماج، اس ناول کا اہم موضوع بن کر سامنے آتا ہے۔

اکیسویں صدی میں اردو ناول نگاروں میں ایک اہم نام محمد حمید شاہد کا ہے۔ حمید شاہد نے اگرچہ افسانہ نگاری اور تنقید میں بھی خاصی شہرت حاصل کی تاہم ناول نگاری میں بھی ان کا نام ہم عصر ناول نگاروں میں نمایاں ہے۔ پاکستان کی تاریخ اور سماج کی عکاسی کے حوالے سے ان کا ناول مٹی آدم کھاتی ہے ایک ایسا ناول ہے جس میں انھوں پاکستانی تاریخ کے اہم واقعہ سقوطِ ڈھاکہ کو ہماری تہذیبی زندگی کے دائرے میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یوں یہ ایک ایسا ناول قرار پاتا ہے جس میں تاریخ، سماج اور تہذیب ایک مضبوط بیانیہ تشکیل دیتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ مٹی آدم کھاتی ہے ان کا پہلا ناول ہے تاہم اس میں انھوں نے جس طرح تاریخ اور سماج کو سمویا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا تاریخ اور سماج کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ ثمر آور بھی ہے۔ وہ اسے ناول کے قالب میں ڈھالنے کی فن سے پوری طرح آگاہ بھی ہیں۔

تاریخ اور سماج کی پیش کش کے حوالے سے بعض معاصر ناول ایسے بھی سامنے آئے ہیں جن میں ناول نگاروں نے بر صغیر کی تاریخ کے ان گزشتہ ادوار کو بھی موضوع بنایا ہے جن میں اس خطے پر نو آبادیاتی تسلط سے قبل مقامی سلطنت میں عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ اس عہد میں تہذیبی و سماجی اقدار کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور تاریخ کے اس عہد کو سامنے لانے کی ایک بھرپور کوشش مرزا حامد بیگ کے ناول انار کلی میں سامنے آتی ہے۔ اس ناول میں مرزا حامد بیگ نے ہندوستان کی تاریخ کے ایک عہد کو بیان کرتے ہوئے جس قدر محنت کی اور جو تحقیقی طریقہ کار اختیار کیا، اس کی وضاحت مبین مرزا کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ :

> یہ ناول اس اعتبار سے الگ تخلیقی تجربہ ہے کہ اس کی تصنیف کے دورانیے میں ربع صدی سے زائد عرصے کی تاریخ، واقعاتی اور متنی تحقیق بھی شامل ہے۔ اردو ناول میں تحقیقی ناول کم کم ہی سہی، لیکن ان کی روایت بہر حال موجود ہے۔ تاہم تاریخ کے جس دور، واقعے اور کرداروں کی یہ تحقیق ہے اور جس انداز سے مرزا حامد بیگ نے یہ تحقیق کی، وہ چیزے دگر ہے۔ یہی نہیں بلکہ جس طرح انھوں نے اپنی تحقیق و جستجو کے حاصلات کو تخلیقی عمل کا حصہ بنایا ہے، وہ بھی داد طلب ہے۔"[۲۰]

اس ناول میں مرزا حامد بیگ نے مغلیہ عہد کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے سماجی رویوں اور تہذیبی اقدار کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ یوں یہ ناول عہد مغلیہ کی ایک ایسی داستان بن کر ابھرا ہے جس میں اس عہد کی تاریخ اور سماج جھلکتے نظر آتے ہیں۔

معاصر اردو ناول نگاروں میں تاریخ اور سماج کی پیش کش کے حوالے سے ایک نام محمد حفیظ خان کا سامنے آتا ہے۔ محمد حفیظ خان کے مختلف ناول شائع ہو چکے ہیں تاہم تاریخ کی عکاسی کے حوالے سے ان کا ناول انوا اسی ایسے ناولوں میں شمار ہوتا ہے جس میں انھوں نے اس عہد کی تاریخی اور سماجی حالات بیان کیے ہیں۔ اس میں اس خطے پر نو آبادیاتی تسلط قائم تھا اور انگریزی استعمار کار یہاں کے خام مال سے زیادہ سے زیادہ معاشی فائدہ حاصل کرنے کے لیے ریل کی پٹڑیاں بچھا رہے تھے۔ ریل کی پٹڑی ایک ایسے قبرستان سے گزرنا ہوتی ہے جس میں گاؤں والوں کے بزرگوں کے قبریں موجود ہیں۔ ابتدا میں بہت مزاحمت ہوتی ہے لیکن استعمار کاروں کی چالوں کے سامنے سب ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ محمد حفیظ خان نے تاریخ کے اس عہد کو بڑی مہارت سے ناول کے کینوس پر اتارنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخ اور سماج کے تعلق کو مضبوط کرتا اکیسویں صدی کا ایک اور معروف ناول می سوزم ڈاکٹر حمیر ااشفاق کی تخلیق ہے۔ ڈاکٹر حمیر ااشفاق کا اگرچہ یہ پہلا ناول ہے تاہم انھوں نے جس طرح مابعد جدید تکنیک بروائے کار لاتے ہوئے اس ناول کو سماجی حالات کا آئینہ بنایا ہے، وہ انھیں معاصر ناول نگاروں میں ممتاز کرتا ہے۔ بلوچستان کے قبائلی علاقوں کے طرزِ زیست کو موضوع بناتے ہوئے انھوں نے اس ناول میں قبائلی علاقوں کے رسم ورواج کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے جنگی ماحول، معاشی بدحالی، خواتین اور غریب طبقے کے استحصال اور سماجی گھٹن کو نمایاں کیا ہے۔

اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے اردو ناولوں میں متنوع موضوعات سامنے آتے ہیں تاہم اس مقالے کی حدود کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے اپنی بحث انھی ناولوں تک محدود رکھی ہے جو تاریخ اور سماج کی پیش کش کے حوالے سے اہم ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ناول نگار سماج کو کسی طور پر بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہر ناول میں ہی کسی نہ کسی سماجی پہلو کو بیان کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف ناول کا کینوس وسیع ہونے کی وجہ سے بہت سے سماجی عناصر بھی اس کی کہانی میں جگہ پانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تاہم بعض ناول ایسے بھی سامنے آئے ہیں جن میں تاریخی واقعات کو بیان کرتے ہوئے ناول نگاروں نے ان واقعات کے سماجی اثرات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں ہمارا سروکار ایسے ناولوں سے ہی رہا ہے۔ گزشتہ صفحات میں جن ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے یہ ایسے ناول ہیں جنہیں ہم اردو کے ایسے نمائندہ ناول قرار دے سکتے ہیں جو تاریخ اور سماج کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان ناولوں میں بعض ناول ایسے ہیں جن میں ایک تسلسل کے ساتھ ایک یا ایک سے زیادہ ادوار کی تاریخ اور سماجی منظر نامے کی عکاسی کی گئی ہے، مثلاً قرۃ العین حیدر اور عبداللہ حسین کے ناول تاریخ کے تسلسل کو سامنے لاتے ہیں جب کہ بعض ناول نگاروں کے ہاں کسی عہد کی تاریخ کے

کسی خاص واقعے کو موضوع بناتے ہوئے ناول کی کہانی تخلیق کی گئی ہے اور اس واقعے کے سماجی اثرات اور ان اثرات کے تحت سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ یوں اردو ناول تاریخ اور سماج کی پیش کش کے حوالے سے خاصا زرخیز واقع ہوا ہے۔ انیسویں صدی میں ناول کے آغاز سے لے کر معاصر ناول تک کے ارتقائی سفر کے دوران میں ناول نگاروں نے برصغیر سمیت دنیا بھر کے مختلف تاریخی واقعات اور ان کے سماجی اثرات کو ناول کا موضوع بنا کر یہ ثابت کیا ہے کہ اردو ناول میں تاریخ اور سماج کی پیش کش اس صنف کی تاریخی، سماجی اور ادبی اہمیت میں اضافے کا باعث بنی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شیباعالم،اردو کے نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء)،ص۵۔

۲۔ ایضاً،ص۶۔

۳۔ سبط حسن،ماضی کے مزار(کراچی:مکتبہ دانیال،۲۰۰۷ء)،ص۲۶۱۔

۴۔ ایضاً،ص۲۶۱۔

۵۔ شیباعالم،اردو کے نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور،ص۱۸۔

۶۔ نگینہ جبین،اردوناول کا سیاسی وسماجی مطالعہ ;۱۹۳۷ اور اس کے بعد،(الٰہ آباد:اے دریا آباد،۲۰۰۲ء)،ص۲۹۔

۷۔ سجاد ظہیر، روشنائی (لاہور:القمر پبلشرز،۲۰۰۶ء)،ص۱۷۔

۸۔ راشدالخیری،مجموعہ راشد الخیری(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء)،ص۶۵۔

۹۔ ابوبکر عباد،"اردوناول:ارتقاسے ترقی پسند تحریک تک"مشمولہ:اردو ناول کی پیش رفت مرتبہ منصور خوشتر(لاہور:بک ٹاک،۲۰۱۹ء)،ص۴۷۔

۱۰۔ محمد افضال بٹ،اردو ناول میں سماجی شعور(اسلام آباد:پورب اکادمی،طبع دوم ۲۰۱۵ء)،ص۱۰۴۔

۱۱۔ عابدہ نسیم،اردو ناول میں مہاجرین کے مسائل (کراچی:انجمن ترقی اردو،طبع اوّل ۲۰۱۸ء)،ص۱۱۲۔

۱۲۔ شیباعالم،اردو کے نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور،ص۱۵۵۔

۱۳۔ ممتازاحمد خاں،اردوناول کے چند اہم زاویے (کراچی:انجمن ترقی اردو،اشاعت دوم ۲۰۱۶ء)،ص۷۸۔

۱۴۔ قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء)، ص۴۱۔۴۲۔

۱۵۔ شاہدنواز،پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ (سرگودھا،شعبہ اردویونی ورسٹی

آف سرگودھا، ۲۰۱۸ء)، ص ۱۷۵۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۶۹۔

۱۷۔ مستنصر حسین تارڑ (قلعہ جنگی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۵۸۔

۱۸۔ مبین مرزا، "اکیسویں صدی کے دو عشروں میں اردو ناول پر اجمالی نظر" مشمولہ: ادبیات (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، شمارہ ۱۲۳۔۱۲۴، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء)، ص ۵۷۔

۱۹۔ امجد طفیل، "پاکستانی اردو ناول اکیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں" مشمولہ: اردو ناول کی پیش رفت، از منصور خوشتر، ص ۱۴۹۔

۲۰۔ مبین مرزا، اکیسویں صدی کے دو عشروں میں اردو ناول پر اجمالی نظر، ص ۶۶۔

باب دوم

ناول نیلی بار اور گراں میں تاریخی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

باب دوم:

ناول نیلی بار اور گراں میں تاریخی و سماجی عناصر کا جائزہ

ناول نثری ادب کی ایسی صنف ہے جو کئی حوالوں سے اپنا امتیاز رکھتی ہے۔ اس صنف کی بڑی خوبی اس میں عہد بہ عہد سموئی جانے والی سیاسی اور تاریخی صداقتیں ہیں۔ اردو ناول نگاری کے آغاز سے عصرِ حاضر تک پہنچتے پہنچتے اردو ناول نے نہ صرف معاصر تاریخ کو اپنے دامن میں جگہ دی بلکہ بہت سے ناول نگار ایسے بھی سامنے آئے جنھوں نے تاریخ کے جھروکوں سے ناول کی کہانیاں اخذ کیں اور ناول کے ذریعے تاریخ اور ادب کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کامیاب ہوئے۔ ایسے ناول نگاروں کی ناولی نگارشات کے ذریعے ادب اور تاریخ میں رشتہ قائم ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کے ذریعے تاریخ کو محفوظ کرنے کا فریضہ بھی انجام دیا جانے لگا۔ ادب اور تاریخ کے تناظر میں ناول کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ناول کے آغاز سے ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور عصرِ حاضر میں بھی یہ روش جاری ہے۔ عصرِ حاضر میں ادب کے ذریعے معاصر تاریخ کو سامنے لانے والے ناول نگاروں میں طاہرہ اقبال کا نام نمایاں ہے۔ ان کے ناول نیلی بار اور گراں اپنے عہد کی سماجی اور سیاسی تاریخ کے مرقع ہیں۔ ان ناولوں میں انھوں نے قیام پاکستان سے لے کر اکیسویں صدی کے ابتدائی سالوں تک کی عصری سیاسی تاریخ کو جس طرح بیان کیا ہے، وہ انھیں عہد حاضر کے نمایاں ناول نگاروں میں شمار کرتا ہے۔

ادب اور تاریخ کے تناظر میں طاہرہ اقبال کے ناولوں کا جائزہ لینے سے قبل اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ایک ناول نگار یا تخلیق کار جو اپنے عہد اور ماضی میں دلچسپی رکھتا ہو، اسے اپنی تخلیقات کے ذریعے سامنے لانے کا متمنی ہو، اس کے لیے لازمی امر یہ ہوتا ہے کہ وہ اس عہد کا مشاہدہ اور مطالعہ وسیع انداز میں کرے جس سے وہ اپنے ناولوں کی کہانی کشید کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ کہانی کی کشید کے اس عمل میں ناول نگار کو یہ خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ تاریخ نہیں لکھ رہا بلکہ تاریخی حقائق سے معمور ادب تخلیق کر رہا ہے۔ یہیں سے ایک تخلیق کار یا ناول نگار کا اصل امتحان شروع ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کی عکاسی کرنے اور تاریخ کو سامنے لانے کے باوجود تاریخ نہیں لکھتا بلکہ ادب لکھتا ہے۔ اپنی تخلیق کو ادب کے دائرے میں رکھنا ہی ایک ناول نگار کی اصل محنت ہوتی ہے۔ سماج اور عہد تخلیق کار کو مواد فراہم کرتے ہیں، اس مواد کو ادبیت کے سانچے میں ڈھال کر قارئین کو پیش کرنا ہی ایک ناول نگار کا کام ہوتا ہے اور یہی وہ فریضہ ہے

جو ایک ناول نگاراور ایک مؤرخ میں خطِ امتیاز کھینچتاہے۔ دیویندر سرا اس ضمن میں ادب اورادیب کافریضہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس میں شک نہیں کہ ادب، زندگی اور سماج کا گہرا رشتہ پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ادب سماج کو براہ راست بیرومیٹر ہے دراصل آرٹ، آئینے اور کیمرے کے فرق کو نظرانداز کرنا ہے۔ کیونکہ ہم فرسٹریشن کے دور میں رہ رہے ہیں۔ اس لیے ہم فرسٹریٹ ہو کر لکھیں گے۔ یا اس دور میں کنفیوژن ہے لہٰذا ادیب کنفیوژڈ ہو کر لکھے گا، صحیح نہیں ہے۔ آرٹ متناعی ہے۔ تخلیق ہے۔ رپورٹ نہیں۔ ہمارا دور ادب کا مواد مہیا کرتا ہے۔ اسے تخلیق کے سانچے میں ڈھالنا اور صنعت گری سے پیش کرنا فن کار کا فریضہ ہے۔[1]

تاریخ اور ادب کے حوالے سے اس بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ادیب تاریخ اور عہد سے مواد حاصل کرتا ہے لیکن اسے ادبی شان سے پیش کرنا ہی اس کی کامیابی تصور ہوتا ہے۔ اس وضاحت کی یہاں اس لیے ضرورت محسوس کی گئی کہ اس باب میں ہم طاہرہ اقبال کے ناولوں کو عصری تاریخ کے تناظر میں دیکھتے ہوئے اس نکتے کو سامنے رکھیں کہ تاریخی حقائق اور تاریخی وارداتوں کے بیان کے باوجود ان کا مقام ایک مؤرخ کی بجائے ایک تخلیق کار کا ہے اور ہمیں ان کی ناول نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے تخلیقی لوازمات کو ہی سامنے رکھنا ہوگا۔

تقسیم اور ہجرت کے واقعات کا جائزہ

طاہرہ اقبال کا ناول "گراں" ایسا ہی ناول ہے جو اردو ناول نگاری میں اپنے موضوع اور اسلوب کی انفرادیت کی وجہ سے ایک منفرد مقام و مرتبے کا حامل ناول قرار پاتا ہے۔ اس ناول میں اگرچہ انھوں نے تاریخ سے زیادہ اپنی توجہ تہذیب و ثقافتی اور سماجی اقدار کی پیش کش پر رکھی ہے تاہم تاریخی حوالے سے بھی یہ ناول مختلف تاریخی واقعات کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ اس ناول کا آغاز قیام پاکستان کے قبل کے تاریخی واقعات کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہوتا ہے۔ ناول کے پہلے باب میں ہی تقسیم ہند کے وقت ہونے والے سانحات کا تذکرہ ملتا ہے۔ تقسیم ہند کا واقعہ ایسا واقعہ تھا جس نے ایک طرف اس خطے میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک الگ آزاد مملکت عطا کی تو دوسری طرف ہجرت کے وقت ہونے والی قتل و غارت نے بھی تاریخ کے چہرے پر کالک مل دی۔ طاہرہ اقبال ان تاریخی سانحات کا تذکرہ کرتے ہوئے سماج کے مختلف طبقوں میں ان سانحات کے خلاف ہونے والے رد عمل کو بھی سامنے لاتی ہیں۔ ان سانحات کے بیان

میں جہاں ان کے ہاں تقسیم کے وقت کے سانحات کی تکالیف کا بیان ملتا ہے وہاں ماضی کے اس ہندوستانی سماج کی عکاسی بھی ملتی ہے جس میں مسلمان اور ہندو اکٹھے رہتے تھے۔ یوں ایک ناسٹلجیائی کیفیت ان کے اس ناول میں نمایاں ہونے لگتی ہے۔ گاؤں کی عورتوں کی زبانی تقسیم کے وقت پیش آنے والے سانحات اور ماضی کی تاریخ کی عکاسی وہ ناول گراں میں یوں کرتی ہیں:

> ہائے باوا خزان سنگھ کی ہٹی ! چھ ماہی ادھار پر سودا چلتا، شادی بیاہ پر گڑ پتاشوں کے تھال مفت بھیجتا۔ ہائے لوٹیاں پڑیں۔ ساگری لٹی، پنڈی سڑی، ہائے لوٹی ---------ہائے بیچاری ہندوانیاں اور سکھنیاں گھٹے گھٹے مکانوں کے تھڑوں پر بیٹھی ساری دیہاڑی چرخہ کاتتیں۔ دونوں بانھیں سونے کے چوڑوں سے بھری ہوئیں، جی بھر کے لٹ پڑی۔ بانھیں کان بھی خالی ہوئے، بھرے گھر خالی ہوئے، ہائے بیٹھے بٹھائے، صدیوں کے جمے جمائے وسیب میں کیسا واہڑا وگیا (ہل چل گیا)۔ عمروں کے ساتھی ایک دوسرے کو کاٹنے وڈنے لگے۔ ہائے ہائے ظلمی---ہائے ہائے لوٹی۔[2]

تاریخ کی عکاسی کے حوالے سے ناول گراں میں سب سے زیادہ توانا عکاسی تقسیم ہند کے سانحات کے وقت کی ہی ہوئی ہے۔ طاہرہ اقبال نے بڑی مہارت سے اس ناول میں تاریخ کو قبل از تقسیم کے ماضی قریب سے ملایا ہے اور ادب کے سانچے میں ڈھال کر اس کی عکاسی کی ہے۔ اس عکاسی میں بھی ان کا زیادہ زور ان یادوں پر ہے جو تقسیم کے وقت ہونے والے سانحات سے گزرنے والے لوگوں کے دلوں میں باقی رہ گئی تھیں۔ ناول کے پہلے باب میں جگہ جگہ اس تاریخی واقعے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ایک جگہ وہ تقسیم کے سانحات سے گزرنے والوں کی یادوں کو یوں ناول کا حصہ بناتی ہیں کہ تقسیم سے قبل مسلم ہندو مشترکہ سماج کی تاریخ سامنے آنے لگتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ہائے نی پتہ نہیں کب سجن دشمن ہوگئے۔ ادھر موہڑے، گورے، تھلے، بگے، کرپال، پرتھے، ساگری، روات سکھوں کی کوئی دکانیں تھیں۔ چھنی عالم شیر میں خزان سنگھ کی ہٹی سب سے بڑی دکان تھی۔---ایسا بھگوان کبھی خالی ہاتھ واپس نہ آنے دیا۔[3]

ناول گراں میں طاہرہ اقبال نے گراں (گاؤں) کی لوگوں کی زبانی تاریخ کے ان واقعات کی بھی عکاسی کی ہے جب اس خطے پر انگریز کا قبضہ تھا۔ انگریز اگرچہ یہاں غاصب کے روپ میں تھے جو یہاں کے وسائل کو اپنی جدی ریاست کی مضبوطی اور استحکام کے لیے استعمال کرتے تھے اور اس عمل کے دوران میں

انھوں نے مقامی جاگیرداروں کے ساتھ مل کر نچلے طبقے کا استحصال بھی کیا، تاہم انگریزی عہد میں بہت سے ایسے اقدامات بھی تھے جن سے عوام میں ان کے بارے میں کسی قدر مثبت رویہ اور اچھی سوچ بھی پائی جاتی تھی۔ ایسے اقدامات میں امن وامان کی بہتر صورت حال بھی شامل تھی۔ طاہرہ اقبال گاؤں کی عورتوں کی زبانی اس صورت حال کے ساتھ ساتھ انگریزی عہد میں طبقہ اشرافیہ کی قدرومنزلت کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔ وہ ناول گراں میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

> "ہائے انگریز کا ویلا، زنانی سیروں سیر سونا مٹکا کر دس کوس چلی جائے نہ عزت کا خطرہ نہ مال کی فکر۔۔۔۔"
>
> "خاندانوں کی عزت تھی۔ کمی کمین چوراچکوں کو جرأت نہ تھی۔ فوج میں بڑی ذاتوں کے لوگ بھرتی ہوتے۔ انگریزی سرکار اپنے درباروں میں خاندانی لوگوں کو کرسی پیش کرتے۔۔۔۔۔ ہائے انگریز بڑی سیانی قوم، ہائے ایسی سست بھائیاں کسی چیز کی کمتی نہ ہوتی۔ زنانیاں سونے سے لدی رہتیں۔ انبار اناج سے خالی نہ ہوتے۔ مارشل ذاتوں کو عزت ملتی۔ سید، اعوان، راجپوت، پٹھان، پانچویں کسی ذات کو تو وہ منہ نہ لگاتے۔[۴]

ناول گراں تاریخ کی عکاسی کرتے ہوئے تقسیم ہند کے سانحات کے بعد جس دور میں داخل ہوتا ہے وہ کشمیر پر ہندوستانی فوج کی یلغار کا عہد ہے جو تقسیم کے کچھ عرصے بعد ہی ہوئی۔ اس جنگ میں جن فوجیوں نے بہادری سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا، ناول گراں سماج میں ان کی قدرو منزلت اور ان کی بہادری سے آگاہی دلاتا ہے۔ طاہرہ اقبال ایک ایسے ہی شہید کی نمازِ جنازہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس تاریخی واقعے کو یوں سامنے لاتی ہیں:

> ہائے کیا جنازہ تھا شہید کا جنازہ ..... ڈغ ڈغ ڈغ فوجیوں کے بوٹ بندوقوں کی جھنکار، پھولوں کی چادریں، مہینوں مٹی کی ڈھیری دکھائی نہ دی اور خوشبو کے ہلارے سے پورا پوٹھوہار مہکتا رہا۔[۵]

ناول گراں میں اگرچہ باقاعدہ طور پر تاریخ کو موضوع نہیں بنایا گیا تاہم مختلف واقعات سے پاکستانی تاریخ کے وہ زاویے سامنے آتے ہیں جنھوں نے اس سماج کو متاثر کیا۔ ایسے ہی زاویوں میں سے ایک اہم زاویہ ستر کی دہائی میں ملک سے ترک سکونت کرکے باہر کے ممالک میں روزگار کے سلسلے میں جانے والوں کے حوالے سے بھی سامنے آتا ہے۔ بہتر مستقبل کی خاطر بیرون ملک جانے کے رواج ستر کی دہائی میں ہی سامنے آیا۔ ناول گراں جو پوٹھوہاری خطے کی تہذیب وثقافت کو سامنے لاتا ہے پاکستانی تاریخ کے اس زاویے کی بھی

عکاسی کرتا ہے۔ طاہرہ اقبال ستر کی دہائی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس ناول میں بیرون ملک جانے کے رجحان کی عکاسی کرتے ہوئے خطہ پوٹھوہار کی صورت حال کو یوں سامنے لاتی ہیں:

> یہ ستر کی دہائی تھی جب پوٹھوار میں سے ہر وہ مرد جو اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکا تھا، ہر وہ بچہ جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ پاسپورٹ بنوا کر بیرون ملک کمائی کرنے چلا گیا تھا۔ بڑے بوڑھوں کا خیال تھا۔ پوٹھوار مردوں سے ایسے ہی خالی ہوا ہے جیسے کبھی لام کے زمانے میں اجڑ گیا تھا۔ عوتوں اور قریب المرگ بوڑھوں کے سوا چلتا پھرتا کوئی مرد نظر نہ آتا تھا۔[6]

یوں یہ ناول پاکستانی تاریخ کی عکاسی کرتا اور ان تاریخی واقعات کے سماج پر اثرات کو سامنے لاتا ہوا جب اسی کی دہائی میں داخل ہوتا ہے تو اس دور میں تعلیم کی طرف لوگوں کے رجحان کو سامنے لاتا ہے۔ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ پوٹھوار کے خطے میں بھی یہ تبدیلی آئی تھی کہ لڑکیاں اعلیٰ تعلیمی اداروں کی طرف بڑھ رہی تھیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کو آزمانے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھیں۔ طاہرہ اقبال ناول گراں میں اس تاریخی تبدیلی کو یوں بیان کرتی ہیں:

> زمانہ بدل رہا تھا۔ ان پڑھ ماؤں کی بیٹیاں کالجوں میں پڑھ رہی تھیں۔ کوئی وکیل تو کوئی فیشن ڈیزائنر بن رہی تھی۔ اسّی کی یہ دہائی پوٹھوار کے ان گراؤں میں ایسے داخل ہوئی تھی جیسے کبھی یہاں گھونٹ گھونٹ بہنے والا برسائی نالہ بارشوں کی رت میں دھانے کھول کر یوں ڈکرانے لگتا تھا کہ سامنے آنے والی ہر شے نگلتا چلا جاتا تھا۔[7]

تاریخ کا دھار بہتا چلا جاتا ہے اور یہ ناول نوے کی دہائی میں داخل ہوتا ہے تو پاکستانی تاریخ میں جدید تعلیم، بیرون ملک کی کمائی، جدیدیت کے کرشموں اور مغرب کی نقالی کے زیر اثر انگریزی زبان ہر شعبے پر اثر انداز ہونے لگتی ہے۔ ملکی سطح کے اس منظر نامے سے پوٹھوار بھی متاثر ہوتا ہے۔ اس کی پوٹھواری بولی میں بھی انگریزی زبان کے الفاظ شامل ہونے لگتے ہیں۔ یوں سماجی سطح پر بھی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں جو تاریخی اہمیت کی حامل قرار پاتی ہیں۔ طاہرہ اقبال نوے کی دہائی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> یہ نوے کی دہائی کی شروعات تھیں جب پوٹھواری زبان میں انگریزی لفظوں کی آمیزش ہونے لگی تھی۔ لڑکیاں لڑکے امپورٹڈ اشیا کی قیمتیں پونڈوں اور ڈالروں میں بتانے لگے تھے۔ اور یورپ کے خریداری مراکز کے نام بولنے لگے تھے۔[8]

مجموعی طور پر طاہرہ اقبال کا ناول گراں تاریخ کو سماجی تناظر میں سامنے لاتا ہے۔ انھوں نے اس

ناول میں پاکستان کی سیاسی تاریخ اور سیاسی اتار چڑھاؤ بیان کرنے کے بجائے پوٹھوار کے خطے کو بنیاد بناتے ہوئے ان تاریخی واقعات سے اس کہانی کو مزین کیا ہے جنھوں نے اس خطے کی تہذیب اور سماج کو متاثر کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں تبدیلی آتی چلی گئی۔

پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ اپنے قیام کے ساتھ ہی یہ نوزائیدہ مملکت مختلف مسائل کا شکار رہی ہے۔ان مسائل اور بحرانوں میں کچھ تو ایسے تھے جو اس خطے میں بسنے والی دیگر اقوام خاص کر ہندو ذہینت اور یہاں پر قابض برطانوی سامراج کی وجہ سے پیش آئے، جب کہ بعض مسائل ایسے بھی ہیں جن کے پیدا ہونے اور پھر آگے ہی آگے بڑھتے چلے جانے میں ہمارا اپنا کردار بھی شامل ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جو ہماری جذباتیت اور کسی حد تک نااہلی اور حالات سے طوطا چشمی کی وجہ سے پیش آئے۔اس ضمن میں اعجاز فاروقی کی یہ رائے صائب نظر آتی ہے کہ :

> جب سے پاکستان قائم ہوا ہے تب سے ہم ایک بحران سے گزر کر دوسرے بحران میں مبتلا ہوتے رہے ہیں۔ مگر ہم نے ان تاریخی واقعات کا تجزیہ کرنے کی شعوری کاوش نہیں کی۔ ہم جذبات کے دھارے پر بہتے رہے ہیں، اور سنجیدہ فکری سطح پر اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم پوری دنیا کو نعرے اور لیبل کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ہم نے اس جذباتی دائرے سے نکلنے کی سعی نہیں کی، اس طرح فکری تحقیق، عقلی شعور اور تجربے کے دروازے اپنے اوپر بند کر رکھے ہیں۔[9]

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی سیاسی تاریخ کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس نے آگے چل کر پاکستان کے سیاسی منظر نامے کو مکدر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ایک طرف ہجرت کے دوران میں پیدا ہونے والے مسائل اور سانحات نے اس نوزائیدہ مملکت کے سماجی منظر نامے کو غیر تسلی بخش بنانے اور بے چینی کی فضا کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا تو دوسری طرف شروع ہی سے سامنے آنے والے سیاسی انتشار نے اہم کردار ادا کیا۔ سیاسی سطح پر سب سے بڑی خامی یہ سامنے آئی کہ ایک عرصے تک یہ مملکت کسی باقاعدہ آئین کے بغیر ہی چلتی رہی جس کی وجہ سے اس کی سمت واضح نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ حکومتی عہدوں پر براجمان نااہل افراد نے بھی مسائل پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر شاہد نواز پاکستان کے ابتدائی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پاکستان کا آغاز فکری، سیاسی اور آئینی طور پر انتشار کا دور تھا۔ مدبران، حکومتی اعلیٰ عہدیدار وقت کی ضرورت اور اہمیت سے روگردانی کرتے رہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں معاملات کو لٹکانے اور مؤخر کرنے کا رجحان ہماری بنیاد کو کھوکھلا

کر گیا۔ سماج کا ہر طبقہ خود کو ریاست کے حقوق اور تحفظ کا ٹھیکیدار سمجھنے لگا۔ اور وہ آزادی اظہار جس کا قائد نے نئی مملکت میں خواب دیکھا تھا، وہ غداری وطن ٹھہری۔ ان تمام مسائل کا حل پاکستان کے آئین میں پنہاں تھا مگر آئین کو بنانے اور لاگو کرنے میں جتنے تساہل کا مظاہرہ کیا گیا وہ اپنی جگہ پر بہت بڑا سوالیہ نشان ہے۔[۱۰]

مارشل لا کے ادوار اور جمہوری حکومتوں کے ادوار کا جائزہ

پاکستان کے ابتدائی سالوں کے اس انتشاری ماحول نے ادب کو موضوعاتی حوالے سے خاصی وسعت دی۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف اُس دور میں لکھنے والے ادیبوں کے فکر و نظر پر ہجرت کے سانحات کے ساتھ ساتھ پاکستان کے اس انتشاری دور کی عکاسی ملتی ہے تو دوسری طرف بعد میں لکھنے والوں نے بھی پاکستانی تاریخ کو ادب کے سانچے میں بیان کرتے ہوئے اس دور کو خاص اہمیت دی ہے۔ دیگر اصناف ادب کی طرح ناول میں بھی پاکستان کی عصری تاریخ کو بڑے ماہرانہ انداز میں ادب کے سانچے میں ڈھال کر بیان کیا گیا ہے۔ طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار ایسے ہی ناولوں میں شمار ہوتا ہے جو قیام پاکستان سے لے کر بیسویں صدی کے آخر تک کی سیاسی تاریخ کو بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔ اس ناول میں سیاسی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہوئے ظفر اقبال لکھتے ہیں:

> نیلی بار شاید پہلا پاکستانی ناول ہے جس میں قیامِ پاکستان سے لے کر تقریباً ساٹھ برس کی تاریخ کو پس منظر میں رکھا گیا ہے۔ اس زمانی دورانیہ میں وقوع پذیر سیاسی حالات و واقعات پر دیہی افراد، طبقات کے ردِ عمل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ یوں دیہاتیوں کا سادہ سا سیاسی شعور جو استحصالی پنجے میں جکڑا رہا، واضح ہو جاتا ہے۔[۱۱]

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم کردار جنرل ایوب خان ہے۔ جنرل ایوب خان کا شمار ان حکمرانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے جب تک حکومت کی عوامی سطح پر مقبولیت بھی حاصل کرتے رہے اور عوامی فلاح کے بے شمار کام بھی کیے، لیکن جب سیاسی اقتدار کا سورج غروب ہونے کو آیا تو جتنی تیزی سے یہ عوامی مقبولیت مخالفت میں تبدیل ہوئی، اس کی مثال بھی کم ہی ملتی ہے۔ ایوب خان نے جس عہد میں زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لی وہ ایسا دور تھا جب ایک طرف سیاسی سطح پر خاصی شکست و ریخت دیکھنے میں آ رہی تھی تو دوسری طرف سماجی سطح پر عوام محرومیوں کا شکار تھے۔ ہجرت کے سانحات کو برداشت کرتے کرتے عوام تھک چکے تھے۔

سیاست دانوں سے انھیں مایوسی ہونے لگی تھی جو اقتدار کے حصول کے لیے مختلف چالوں میں مصروف تھے لیکن عوامی فلاح کا کوئی ایجنڈا سامنے نہیں آرہا تھا۔ ایسے حالات میں ایوب خان کا حکومت سنبھالنا عوام کے نزدیک ایسا مستحسن عمل تھا جس میں انھیں اپنے دکھوں کا مداوا نظر آنے لگا تھا۔ طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار ہمیں اس پاکستانی سیاسی تاریخ کے اس عہد کے حالات کے ساتھ ساتھ عوام کے سیاسی شعور سے بھی آگاہی دلاتا ہے۔ انھوں نے اس ناول میں ایوب خان کے دور کے حالات بیان کرتے ہوئے مارشل لا لگنے کے بعد عوامی جذبات کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے۔ جنرل ایوب نے حکومت سنبھالنے کے بعد زراعت کی طرف خصوصی توجہ دی۔ جو زرعی اصلاحات نافذ کی گئیں ان میں جاگیرداروں کے لیے جاگیر کی ایک حد مقرر کرتے ہوئے، اضافی زمینیں ہاریوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ ان اصلاحات نے غریب اور پسے ہوئے طبقے میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ جنرل ایوب نے اپنے دور حکومت میں جس کام سے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ زرعی اصلاحات تھیں۔ ایوب خان اس حقیقت سے آشنا تھے کہ پاکستان کی معیشت اور اس کے سماجی منظر نامے میں خوشحالی لانے کے لیے زراعت کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف انھوں نے زرعی زمینوں کی زرخیزی میں اضافہ کرنے اور آبی ضروریات کو پورا کرنے کی طرف خاص توجہ دی تو دوسری طرف بڑے زمینداروں سے ایک خاص حد سے زیادہ زمین واپس لے کر بے زمین کسانوں میں تقسیم کرنے کی پالیسی بھی لاگو کرنے کی ٹھانی۔ طاہرہ اقبال نیلی بار میں پاکستان کی تاریخ بیان کرتے ہوے ایوب خان کے ان اقدامات کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ جب بے زمین کسانوں میں زمینیں تقسیم کرنے کا اعلان کیا گیا تو وہ کسانوں جو نسل در نسل زمینداروں کی غلامی میں پستے چلے آرہے تھے، انھیں اپنے روشن مستقبل کا وہ خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر آیا جو وہ سالوں سے دیکھ رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایوب خان کو ایک مسیحا سمجھنے لگے۔ اس دور میں ایک نعرہ عام ہوا تھا کہ جو "جو واہوے اوہ ای کھاوے" یعنی جو زمین کاشت کرتا ہے وہی اس سے پورا فائدہ اٹھانے کا حق دار ہے۔ طاہرہ اقبال ایوب خان کی ان اصلاحات اور سماج پر ان کے اثرات کو جائزہ لیتے ہوئے نیلی بار میں اس کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

> یہ جو اونچی حویلی کی حفاظت میں حلق پھاڑ رہے ہیں نا اب یہی اس حویلی کے مالک ہونے والے ہیں۔ ابھی بھی جنرل ایوب نے اعلان کیا ہے کہ زرعی اصلاحات ہوں گی ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مزارع جس کھیت کو کاشت کر رہا وہ اسی کھیت کا مالک بنا دیا جائے گا۔[12]

ایوب خان کی ان اصلاحات کی وجہ سے سماج کے عام لوگ حد سے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایوب خان کے دور تک پاکستان کا سیاسی اور سماجی منظر نامہ خاصا انتشار کا شکار نظر آتا ہے۔ ہجرت کے اثرات کی وجہ سے سماجی تاریخ انتشار سے بھرپور دکھائی دیتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی چالبازیوں کی وجہ سے شروع ہی سے عوام کی فلاح کا کوئی بڑا منصوبہ سامنے نہیں آیا تھا۔ ایسے حالات میں جب ایوب خان نے اصلاحات کا ڈول ڈالا تو عوام کو ایوب خان کے روپ میں ایک ایسا مسیحا نظر آنے لگا جو ان کے دکھوں کا مداوا کرنے والا حقیقی رہنما تھا۔ عوام میں ایوب خان کے بارے میں جو رائے سامنے آ رہی تھی، طاہرہ اقبال نیلی بار میں اس کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

> اوئے نالائقو جاگلیو! فوجی اندر کا بندہ ہے اور اب سرکار فوج کی ہے۔ اس کے پاس سب خفیہ خبریں ہیں۔ غور سے سنو! تمہارے دن پھرنے والے ہیں۔ نیا بادشاہ غریبوں مزارعوں کا ہمدرد ہے۔[۱۳]

یہ فوجی اس ناول کا کردار فوجی نصیر ہے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے آیا ہوتا ہے۔ جاگیرداری نظام کا بہت بڑا مخالف ہے اور ایوب خان کی حکومت آتے ہی کسانوں کو جاگیرداروں کے خلاف اکساتا ہے۔ ایوب خان کی اصطلاحات کے اعلان سے معاشرے میں پسے ہوئے طبقے نے زندگی کا ایک نیا زاویہ دیکھا اور ہر خبر کو سچ سمجھ کر زمینداروں کی بغاوت پر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن حقیقت کھلنے پر انھیں احساس ہوا کہ کچھ بھی نہیں بدلا۔ حالات کے نہ بدلنے کی بڑی وجہ بھی وہی جاگیردار طبقہ تھا جو سال ہا سال اور نسل در نسل غریبوں پر مسلط تھا۔ اس طبقے کے خلاف ایوب خان نے اعلان تو ضرور کیا اور کسی حد تک عملی کارروائی بھی کی لیکن وہ مکمل طور پر اس طبقے کو زیر کرنے میں ناکام رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ طبقہ سماج سے لے کر حکومت تک ہر جگہ پر اپنا اثر و رسوخ رکھتا۔ ایوب خان کی اصلاحات کے اعلان کے بعد بھی اس طبقے نے اپنی شاطر چالوں کے ذریعے ان اصلاحات کو مکمل طور پر کامیاب نہ ہونے دیا۔ ڈاکٹر شاہد نواز، ایوب خان کے دور کی زرعی اصلاحات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اسی دور میں زرعی اصلاحات کا ڈول ڈالا گیا، جو کہ اپنے نفاذ میں ڈھیلا ہونے کے سبب مطلوبہ مقصد حاصل نہ کر سکا۔ بڑے بڑے جاگیرداروں نے اپنی جاگیریں اپنی اولادوں، عزیزوں اور قابل بھروسہ ملازمین کے نام الاٹ کروا دیں، ریاستی مشینری کو اس کا پتہ ہونے کے باوجود کچھ نہ کیا جا سکا۔[۱۴]

یہی وجہ ہے کہ ایوب خان کی اصلاحات مطلوبہ مقاصد کے حصول میں ناکام رہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ ان اصلاحات کی ناکامی نے بھی پاکستانی سماج کو متاثر کیا۔ وہ کسان اور غریب عوام جو نسل در نسل جاگیرداروں کی غلامی میں پستے چلے آرہے تھے، ایوب خان کی اصلاحات کے نعرے سے شہ پاکر جاگیرداروں کے سامنے سر اٹھانے لگے۔ لیکن جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ کچھ بھی نہیں بدلا بلکہ صورت حال منٹو کے نیاقانون والی ہی ہے تو اس کے نتائج بھی وہ سامنے آئے جو منگو کوچوان کو درپیش آئے تھے۔ کسانوں کو ان کے حقوق کے نام پر جاگیرداروں کے خلاف اکسانے والے سماجی عناصر نے جب ایسے کسانوں کو بے یارومددگار چھوڑ دیا تو وہ جاگیرداروں کی نظروں میں بھی باغی ٹھہرے۔ اس بغاوت کی سزا بھی بھگتنی پڑی۔ فوجی نصیر کے کہنے پر اس کی باتوں میں آکر جب کسانوں نے جاگیرداروں کے خلاف بغاوت کی تو اسی جاگیردار کے کہنے پر قانون نافذ کرنے والے اداروں نے ان کسانوں کے ساتھ جو سلوک کیا، نیلی بار میں اس کی عکاسی ملاحظہ ہو:

> ابھی مجمع زمینوں کی تقسیم ہی طے کر رہا تھا کہ پولیس کی پوری گارڈ نے دھاوا بول دیا۔ نئے نئے زمیندار بننے کے نشے اس ناگہانی حملے سے سنبھل ہی نہ پائے۔ پولیس کے ڈنڈے، بندوقوں کے بٹ، بھاری بوٹ اور تنومند چانٹے اور چھپڑ کوئی ایسا پلسی ہتھیار نہ تھا جو وہاں کارآمد نہ ہوا۔[۱۵]

یہ سب کچھ غریب کسانوں کے ساتھ مہاجر فوجی نصیر کے اکسانے پر ہوا۔ فوجی حکومت ہونے کی وجہ سے لوگ اس فوجی نصیر کی باتوں پر اندھا اعتماد کرتے تھے، لیکن جب حقیقت کھل کر سامنے آئی تو انھیں معلوم ہونے لگا کہ سب کچھ اک سراب ہے۔ ان کی بے بسی پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ پہلے یہ غریب کسان جاگیرداروں کی صرف غلامی کرتے تھے اور غیر مشروط طور پر ان کے وفادار تھے لیکن اب اس صورت حال کے بعد انھیں جاگیرداروں کے سامنے اپنی صفائی بھی پیش کرنے کی ضرورت پیش آنے لگی اور اپنی وفاداری کا یقین بھی دلانا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ناول نیلی بار میں ذیلدارنی کی ملازمہ اپنے غریب مردوں کی صفائی دیتے ہوئے کہتی ہے:

> ذیلدارنی جی سردارنی جی ہمارے بندوں کا کوئی قصور گناہ نہیں۔ وہ شوہدے تو ان پڑھ ناسمجھے بے عقلی یہ تو مہاجروں کا ڈالا ہوا رولا ہے مکانی جی! انھیں چھتر لگوائیں تاکہ آگے سے ہم بھولے غریبوں کو یہ نہ ورتیں۔ ساڈے کملے مرداں نوں ورتیانے تے تہاڈے نال دشمنی سیڑھی نیں۔۔۔[۱۶]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں نہ صرف تاریخ کے مختلف واقعات اور اتار چڑھاؤ کو بڑی کامیابی سے بیان کیا ہے بلکہ ان تاریخی واقعات کے سماج پر پڑنے والے اثرات کو بھی نمایاں کیا ہے۔ یہی ایک تخلیق کار کا بڑا وصف ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کو ادب کے سانچے میں یوں ڈھالتا ہے کہ تاریخ اور سماج کا رشتہ بھی سامنے آنے لگتا ہے۔ طاہرہ اقبال اس رشتے کو سامنے لانے میں کامیاب رہی ہیں۔

ایوب خان کے دور حکومت کا ایک اہم واقعہ بلدیاتی انتخابات ہیں۔ ایوب خان نے زمانۂ اقتدار سنبھالنے کے بعد بنیادی جمہوریت کے نظام کو نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ ۱۹۵۹ء میں انھوں نے بنیادی جمہوریت آرڈیننس بھی نافذ کیا اور آگے چل کر ۱۹۶۲ء کے آئین میں اسے انتخابی کالج کا درجہ دیا گیا۔ ۱۹۶۳ء میں دیہی ترقیاتی پروگرام بھی شروع کیے گئے تاکہ بلدیاتی نظام کے ذریعے بنیادی سہولیات کی فراہمی کی راہ بھی ہموار کی جاسکے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی تاریخ کے پہلے بلدیاتی الیکشن کروانے کا سہرا بھی ایوب خان کے دور حکومت کے سر ہے۔ ۱۹۵۹ء کے بلدیاتی انتخابات نے پاکستان میں بنیادی جمہوریت کے نظام کی بنیاد ڈالی۔ ایوب خان کے دور میں جب ان بلدیاتی الیکشن کا شور بلند ہوا تو سماج میں اس حوالے سے بھی سیاسی شعور دیکھنے کو ملا۔ ان انتخابات میں بھی جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ آگے آگے رہا اور بنیادی جمہوریت کے انتخابات میں یہی طبقہ نشستوں پر براجمان ہوا۔ اس کی وجہ بھی اس طبقہ کا عوام اور حکومت پر اثر انداز ہونا تھا۔ اس دور میں مہاجر طبقہ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے آیا تھا وہ اس جاگیردار طبقے کو استحصالی طبقہ بھی سمجھتا تھا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جس طرح جعلی کلیم داخل کروا کے مقامی جاگیرداروں نے وقف املاک اور جاگیروں پر قبضہ جمایا تھا وہ حقیقت میں مہاجرین کا استحصال ہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایوب خان کے دور میں مہاجر طبقے کو اپنی بقا اسی میں نظر آنے لگی تھی کہ اس مقامی جاگیر دار طبقے کو کمزور کیا جائے اور ان کی جاگیروں سے محرومی کے ساتھ ساتھ سماجی مراتب بھی ان سے واپس لیے جائیں۔ یہ روش اس وقت کے سماج کا ایک اہم رجحان بن چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سماج میں جاگیرداروں اور مہاجروں کے درمیان رسہ کشی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ نیلی بار کا فوجی نصیر بھی ایسا ہی مہاجر ہے جو مقامی جاگیرداروں کو استحصالی نظام کے مہرے سمجھتا ہے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایوب خان کے دور میں جب بنیادی جمہوریت کے نام بلدیاتی الیکشن کا اعلان ہوا تو بھی یہ مقامیت اور مہاجرت کا عنصر سامنے آیا۔ مقامی جاگیرداروں اپنے کسانوں اور ان کے گھر والوں پر اس حد تک اثر ورسوخ تھا کہ ان کے سامنے کوئی دم مارنے کی مجال بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ وہ

مہاجرین جو ان جاگیرداروں کے خلاف تھے، جاگیرداروں کے مزارعے اور ان کی عورتیں بھی ان مہاجرین کے خلاف تھے۔ طاہرہ اقبال اس تاریخی حقیقت کو یوں سامنے لاتی ہیں:

> یہ مہاجر کیوں شر پسند ہیں۔ ان کے دلوں سے خوف نکلا ہوا ہے۔ یہ خون کے دریا جھاگ کر آئے ہیں۔ یہ سکھوں میں رہتے ہوئے ہیں آئے ہیں جو مغز پھرے او ربے خوف ہوتے ہیں۔"
>
> "لیکن اب ان کے دلوں میں خوف پیدا کرنا پڑے گا ورنہ تو یہاں کی سیاست بگڑ جائے گی۔۔۔۔"
>
> ہاں کیوں نہیں ہمارے جدی پشتی ووٹر ہیں۔ یہ فوجی حکومت بھی کوئی بلدیاتی الیکشن وغیرہ کروانے کا سوچ رہی ہے۔ آپ ہمارے امیدوار ہوں گے بی ڈی ممبر اور چیئرمین یونین کونسل ہوں گے۔[17]

ذیلدار اور مقامی جاگیرداروں کا اس دور میں اثر ورسوخ اتنا بڑھا ہوا تھا کہ حکومتی ایوانوں تک ان کی رسائی تھی۔ گہری نظر سے اگر دیکھا جائے تو ایوب خان کے دور میں بھی یہ جاگیردار طبقہ اور ذیلدار اسی طرح کے اختیارات کے مالک تھے جو نوآبادیاتی عہد میں جاگیرداروں کو حاصل تھے۔ ایک طرف عوام کو اپنے ماتحت رکھنا اور اپنے کام نکلوانا ان کے مرغوب مشغلہ تھا تو دوسری طرف اسی عوام کا استحصال بھی کیا جاتا تھا۔ اس استحصالی عمل میں وہ حکومتی کارندے اور ادارے بھی شامل ہوتے تھے جن پر ایسے جاگیرداروں اور ذیلداروں کا رعب اور اثر ورسوخ تھا۔ طاہرہ اقبال پاکستان کی عصری تاریخ کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس طبقے کے اثر ورسوخ اور اس کی نوآبادیاتی سوچ کو یوں سامنے لاتی ہیں:

> ذیلدار صاحب اپنا ہر انتظامی و سیاسی کام انھیں اسمبلی ممبران کو جتوا کر ہی حاصل کر سکتے تھے۔ ان سے تعلق رکھنا ان کے لیے علاقے میں باعثِ عزت اور باعثِ رعب تھا۔ ایک ایسی دعوت جس میں وزیر صاحب اور مقامی انتظامیہ شامل ہوتی ہے وہ اگلے الیکشن تک مقامی آبادی کو ان کا تابع بنانے کو کافی ہوتی تھی۔ متعلقہ تھانیدار اور پٹواری و تحصیل دار حکم عدولی کی جرأت نہیں کر سکتے، جس کسی کو حوالات میں بند کروانا ہو، چھتر لگوانے ہوں ناجائز اسلحہ ڈلوانا ہو، رسہ گیری اور اغوا میں پکڑوانا ہو صرف منشی کے ہاتھ بھیجا گیا پیغام ہی کافی ہوتا ہے۔[18]

پاکستان کے سیاسی و سماجی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے تو جب بھی کوئی نئی حکومت آتی ہے یا مارشل لا کے ذریعے آمریت مسلط کی جاتی ہے تو شروع میں اصلاحات اور ترقی کے بڑے دعوے کیے جاتے ہیں اور

نظام کو بدلنے کے خوب صورت خواب دکھائے جاتے ہیں ۔ عوام بھی ان خوابوں کی اسیر ہو کر آنے والے کو نجات دہندہ اور جانے والے کو غاصب سمجھنے لگتے ہیں لیکن کچھ ہی وقت گزرنے کے بعد یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ کچھ بھی بدلنے والا نہیں ہے۔ وہی اشرافیہ طبقہ ، سرمایہ دار اور جاگیردار اس نئی حکومت کو بھی اپنے مفادات کے میدان میں لے آتے ہیں یوں حالات پہلی ڈگر پر ہی چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جنرل ایوب خان کے دور میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مارشل لا کے بعد کچھ عرصہ تو سختی کی وجہ سے کافی امن رہا لیکن پھر حالات پہلے کی ڈگر پر چلنے شروع ہوئے۔ طاہرہ اقبال اس کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

> مارشل لا کے بعد والی سختی اور خوف اب معمولات میں تبدیل ہو رہا تھا۔ ملک فتح شیر جب لاہور سے واپس آیا تو اس کے چھپے ہوئے رسہ گیر، ڈکیت پھر علاقہ میں گھومنے لگے۔ بی ڈی ممبروں کے لیے الیکشن کی مہم شروع ہو چکی تھی۔[19]

طاہرہ اقبال کا سماجی مشاہدہ اور مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ انھوں نے نیلی بار میں پاکستانی سیاست کی اونچ نیچ کو سامنے لاتے ہوئے سیاسی سرگرمیوں کا نقشہ بڑی مہارت سے کھینچا ہے۔ بلدیاتی انتخابات کے دوران میں جس طرح مقامی لوگوں نے الیکشن مہم میں حصہ لیا اور جس طرح مقامی سطح پر سیاسی ہلچل پیدا ہوئی اس کی تصویر کشی کرتے ہوئے وہ نیلی بار میں لکھتی ہیں:

> الیکشن مہم علاقے میں الیکشن کا ہنگامہ گرم تھا۔ گوبر کے ڈھیروں ، اپلوں کے گوہیروں اور کچے کوٹھوں ، ذرا ذرا سی کچی کوتاہ قد ہٹیوں، اپلے تھپی دیواروں ، ٹیوب ویل کی پکی کوٹھڑیوں کو انتخابی بینروں، پوسٹروں اور تصاویر نے لپیٹ رکھا تھا۔ کئی بار ایک دوسرے کے بینر پھاڑے گئے ۔ اسلحے کی نمائش ہوئی ، پٹاخے چلے ، علاقے کی فضا سنسنی خیزی اور انتظار کی کیفیت سے بوجھل تھی۔[20]

یوں جنرل ایوب خان کی سیاسی تاریخ اور اس عہد کے سیاسی منظر نامے کو اس ناول میں بڑی مہارت سے اجاگر کیا گیا ہے۔ عصری تاریخ کے حوالے سے جنرل ایوب خان کی سیاست اور اس عہد سے آگے بڑھتے ہوئے یہ ناول ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی سیاسی پارٹی پاکستانی پیپلز پارٹی کی سیاسی سرگرمیوں اور بھٹو کی عوام میں مقبولیت اور بھٹو کی سیاست کے اہم واقعات سے بھی آگاہی دلاتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو پاکستانی سیاست کا ایک ایسا کردار ہے جس نے نہ صرف سیاست کو عوام تک پہنچایا بلکہ ایک جاگیردار طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے کے ذریعے اپنا ہمنوا بنانے میں بھی کامیاب رہا۔ اپنے عہد میں اگرچہ بھٹو متنازعہ شخصیت بھی رہے تاہم بعد میں بھٹو کو پاکستانی

سیاست میں وہ اہمیت حاصل ہوگئی کہ آج ان کے مخالفین اور حامی دونوں ان کا نام احترام سے لیتے ہیں۔ بھٹو عوام کا رمز شناس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بھوک اور افلاس کے ساتھ ساتھ بنیادی حقوق سے محروم عوام کو سیاسی عمل میں اپنا ہمنوا بنانے کا اس سے بڑھ کر اور کوئی حربہ کار گر ثابت نہیں ہو سکتا کہ انھیں ایک طرف ان کی محرومیوں کا احساس دلایا جائے تو دوسری طرف ان محرومیوں کا مداوا بھی پیش کیا جائے۔ بھٹو کی عوامی مہم نے اس حوالے سے خاص کامیابی حاصل کی کہ عوام کو اس کی صورت میں ایک ایسا نجات دہندہ نظر آنے لگا تھا جو ان کی محرومیوں کو آسائشوں میں بدل سکتا تھا۔ بھٹو نے عوام کے بنیادی حقوق کا نعرہ بلند کیا تو عوام ان کے ساتھ نکل کھڑی ہوئی۔ طاہرہ اقبال اس عہد میں بھٹو کی مقبولیت اور عوام کے ذہنوں میں اس کی اہمیت کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

> اوئے وریامے! تو کبھی شہر جائے تو دیکھے کہ ساری خلقت کے دلوں میں اس طرح پھوٹ پڑا ہے جیسے راتوں رات مٹی کی کوکھ سے بیج پنگر تا ہے ۔۔۔۔ سب کو پتا ہے کہ یہی ہمارا اجالو ہے، یہی ہے وہ جو ہمارے گلوں میں پڑے غلامی کے سنگل کو کھلوائے گا۔۔۔۔۔۔۔ بھٹو ہے نام اس کا۔ہاں ۔۔۔ بھٹو ۔۔۔ بھٹو ۔۔یاد کرلو یہ نام اور کنک کے بیج کی طرح اسے اپنے سینے کے کھیت میں بو دو۔۔ اس نام کی خوشبو چار چوفیرے یوں پھیلا دو جیسے شرنہہ اور دھریک کے پھولوں کی مہک چیت بساکھ میں پھیل جاتی ہے۔[۲۱]

بھٹو جوں جوں عوامی مہم میں آگے بڑھ رہا تھا، عوام میں مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ یہ مقبولیت ملک کے شہری علاقوں سے نکل کر دیہاتی علاقوں تک بھی جا پہنچی تھی۔ دیہاتی سطح پر ہم دیکھتے ہیں کہ سادہ لوح لوگ اپنے حقوق سے بھی مکمل آگاہی نہیں رکھتے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے نزدیک زندگی محض جاگیرداروں اور وڈیروں کی خدمت کا نام تھی۔ نسل در نسل یہ محنت اور مشقت بھی کرتے آرہے تھے لیکن ان کی زندگیوں میں کوئی فرق نہیں آرہا تھا۔ اس محرومی کی ایک وجہ ان میں اس شعور کی کمی تھی کہ جن جاگیروں پر وہ محنت کرتے ہیں اور جس خون پسینے سے وہ اس مٹی کو گلزار بناتے ہیں، اس میں ان کا بھی حصہ ہے۔ بھٹو نے جب عوام کو یہ شعور دیا تو جاگیرداروں کے مقابلے میں عوام کو بھی اپنے حقوق کا احساس ہوا۔ وہ یہ سوچنے پر آمادہ ہوئے کہ زندگی ان جاگیرداروں کی غلامی کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس شعور نے بھٹو کو وہ مقبولیت عطا کی وہ عوام کے نزدیک ایک عقیدے کا درجہ اختیار کر گیا۔ وہ دیہاتی سادہ لوح لوگ جو نسل در نسل

جاگیرداروں کی غلامی میں بندھے آرہے تھے، بھٹو کے بارے میں ایک دوسرے اپنے خیالات کا اظہار یوں کرنے لگے:

> نبی، پیغمبر خدا خود بھیجتا ہے۔ جب خلق خدا پر جاگیرداروں، امیروں کا یہ کالا ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو پھر اس بستی میں ایسے ہی نبی اور پیغمبر اترتے ہیں۔ ان کا پیغام بیج کے چھٹے کے طرح کھیت، ہر بیگھ میں برس کر انگور نکال لاتا ہے۔[۲۲]

بھٹو خود جاگیردار طبقے سے تعلق رکھتا تھا، لیکن وہ عوام کا رمز شناس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عوام جاگیرداری نظام کے استحصال کا شکار ہے اور عوامی رائے کو اپنے حق میں کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں ہو سکتا کہ اس جاگیرداری نظام کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ اس کے علاوہ وہ ایوب خان کے دور میں جاگیرداری نظام کے خلاف ہونے والے اقدامات کی عوامی مقبولیت سے بھی آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کرتے ہوئے جاگیرداری نظام میں پستے ہوئے عوام کو ایک نئی راہ دکھائی۔ اس نعرے نے نہ صرف ملک گیر مقبولیت حاصل کی بلکہ اسی نعرے کی بنیاد پر جاگیرداری نظام کے ستائے ہوئے عوام بھٹو کے ہمنوا بھی بنتے چلے گئے۔ بھٹو عوام میں شعور پیدا کرنے میں کامیاب رہے تھے کہ اس دھرتی پر صرف جاگیرداروں کا ہی نظام نہیں ہے بلکہ عوام کی بھی اہمیت ہے۔ جاگیردار طبقہ اپنی جاگیروں کی وجہ سے عوام کا جو استحصال کرتا ہے، بھٹو کے دور میں اس استحصال کے خلاف عوامی شعور بھی اجاگر ہو گیا تھا۔ طاہرہ اقبال اس عوامی شعور کی عکاسی بھٹو عہد کے عوام کے ذریعے یوں کرتی ہیں:

> تم ان کے منجے پیڑھے ٹھونکو، ہل پھال تراشو، بوہے باریاں بناؤ، صبح شام سلام کرنے ڈیرے پر حاضر ہو۔ لیکن وہ ہر چوتھے دیہاڑے تمہیں بے دخل کر دیں۔ تم ان کے پیروں پر سر پٹخو، ترلے ڈالو اور ٹھڈے ماریں۔ بے گھر کر دیں، بھٹو تمہارے بچوں کو چھت دے گا۔ اس کا نعرہ ہے۔
>
> "روٹی، کپڑا اور مکان۔"[۲۳]

ایک طرف بھٹو کا یہ نعرہ عوام میں مقبولیت حاصل کر رہا تھا تو دوسری طرف عوام میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جو اس نظام کو بدلنے کی امید کھو بیٹھے تھے۔ مایوسی ان کے دلوں میں گھر کر چکی تھی۔ وہ یہ جان چکے تھے کہ کوئی بھی حکمران ہو اصل حکمرانی وڈیرہ شاہی کی ہی ہے۔ جاگیردار اور صنعت کار ہی بھیس بدل بدل کر حکومت میں آتے ہیں اور عوام کا خون چوستے ہیں۔ طاہرہ اقبال کا اعجاز یہ ہے کہ وہ عوام کے سیاسی شعور اور سیاسی سمجھ بوجھ کا مشاہدہ کرتے ہوئے دونوں زاویوں کو مد نظر رکھتی ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو بھٹو

سے امید لگائے بیٹھے تھے کہ یہ نظام کو بدلے گا بھی اور عوام کو اس کے حقوق بھی دلائے گا دوسری طرف ایسے لوگ بھی سماج کا حصہ تھے جن کے نزدیک بھٹو بھی دوسرے حکمرانوں کی طرح اسی ڈگر پر چلے گا جو قیام پاکستان کے بعد سے جاری ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بھٹو عوام میں مقبول ضرور تھا لیکن اس کا خاندانی پس منظر جاگیر دارانہ تھا۔ طاہرہ اقبال عوام کے اس سیاسی شعور کی عکاسی ایک کردار کے ذریعے یوں کرتی ہیں:

> اوئے پاگلو! یہ سب بڑے لوگ اندر سے ملے ہوتے ہیں، جیسے بوڑھے ون اور برگد شاخیں پھنسائے، داڑھیاں ملائے اندر ہی اندر سرنگیں بنائے اک مک ہوتے ہیں اور نئے پودوں کو سانس نہیں لینے دیتے۔ ساہ پی جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بڑے بھی، زمیندار اور وڈیرے بھی۔۔۔[۲۴]

بھٹو نے عوام کے اس مزاج کو جان لیا تھا کہ عوام وڈیرہ شاہی سے تنگ ہے اس لیے اس نے عوام کو یہی شعور دیا کہ جو محنت کرتا ہے اسے عزت کی زندگی گزارنے کا بھی حق حاصل ہے۔ کسی جاگیر دار یا وڈیرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کی عزت نفس کو مجروح کرے یا اس کا استحصال کرے۔ دیکھا جائے تو جنرل ایوب کی زرعی اصلاحات میں بھی اسی نکتے کو بنیاد بنایا گیا تھا لیکن جنرل ایوب اس پر مکمل طور پر عمل نہ کروا سکے اور وہی وڈیرہ شاہی اور جاگیر داری نظام ہی قائم رہا۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ عوام میں ایک سوچ ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ اس جاگیر داری نظام کے استحصال سے نکلا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھٹو نے عوام کا نعرہ بلند کیا تو عوام کو ایک بار پھر اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آنے لگی۔ عوام میں یہ سوچ پروان چڑھنے لگی ان کی فلاح اور نجات بھٹو کے راج میں ہی ہے۔ بھٹو کی اس ملک گیر مقبولیت اور عوام میں بھٹو کے روپ میں ایک مسیحا کا تصور راسخ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ طاہرہ اقبال عوام کے اس مزاج کی عکاسی نیلی بار میں بڑی مہارت اور حقیقت پسندانہ انداز میں کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> جب بھٹو کا راج آئے گا، تم بڈھوں کو اس چھوٹی سی لڑکی کے احترام میں کمریں دوہری کر کے کھڑا نہ ہونا پڑے گا۔ اس قبر جیسی ہٹی کی کھال میں چھپ چھپ کر اپنے حق کی بات نہ کرو گے بلکہ ان ملکوں ان زمینداروں سے ہاتھ پنجہ کر کے کہو گے جو کہو گے۔۔ جب بھٹو کا راج آئے گا۔ جب بھٹو تخت پر بیٹھے گا۔[۲۵]

اُس دور میں ایک طرف بھٹو کی عوامی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی تو دوسری طرف جنرل ایوب کے خلاف عوامی مزاحمت میں بھی تیزی آ رہی تھی۔ ایک طرف "روٹی، کپڑا اور مکان" کے نعرے لگ رہے تھے

تو دوسری طرف جنرل ایوب خان کی مخالفت میں بھی نعرے عوام کی زبان پر تھے۔ جنرل ایوب خان نے اپنے خلاف ہونے والی اس مزاحمت کو شروع میں طاقت کے استعمال سے بھی کچلنا چاہا لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ طاہرہ اقبال اس ضمن میں ایوب خان کے دورِ اقتدار کے آخری دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس دور کی سیاسی سرگرمیوں اور عوام کے سیاسی شعور کو یوں واضح کرتی ہیں:

> پولیس لڑکوں کا پیچھا کرتے ہوئے کینٹین تک آن پہنچی تھی۔ لڑکے میزوں، دیواروں درختوں پر چڑھ کر بے تحاشہ نعرے لگانے لگے۔
> "ایوب کتا ہائے ہائے ۔۔ بھٹو ساڈا آوے ای آوے۔" جواباً گولیوں اور آنسو گیس کے شیلز کی بوچھاڑ آئی۔[۲۶]

بھٹو نے عوامی حمایت کے لیے روٹی کپڑا اور مکان کا جو نعرہ لگایا تھا وہ عوام میں مقبول تو ہوا لیکن سیاسی منظر نامے پر اس وقت بھٹو اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے مخالف جماعتیں بھی اسے زیر کرنے کے لیے عوام میں اپنا نقطہ نظر بیان کر کے عوامی رائے کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ پاکستانی سیاست میں ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی مخالفین نے ایک دوسرے کے قول و فعل کے تضاد کو اپنی سیاست چمکانے کے لیے خوب استعمال کیا۔ بھٹو کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ تو دے رہا۔ ہاریوں کو جاگیرداروں کے تسلط سے آزاد کرانے اور ان میں زمینیں بانٹنے کے خواب تو دکھا رہا تھا لیکن اس کا اپنا تعلق ایسے طبقے سے تھا جس کا شمار پاکستان کے بڑے جاگیرداروں میں ہوتا ہے۔ بھٹو کے مخالفین نے سماجی سطح پر ان کے خلاف اس نکتے پر خوب سیاست چمکائی کی کہ خود جاگیروں کا مالک کیسے عام شخص کی زندگی بدل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی سطح پر وہ لوگ جو جاگیردار تھے یا طبقہ امرا سے تعلق رکھتے تھے، وہی بھٹو کے سب سے بڑے نظریاتی مخالف تھے۔ وہ اس کی مخالفت میں جو سب سے بڑی دلیل استعمال کرتے تھے، طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں ملکانی کے ذریعے اس کی عکاسی بڑی مہارت سے کی ہے۔ ملکانی اپنی ملازماؤں کو ڈانٹتے ہوئے کہتی ہے:

> بھٹو ان کی ماں کا یار انھیں زمینیں دے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ گدھیو! خود تمہارا یہ خصم ہزار مربعے کا مالک ہے۔ صبح گاڑی چلے تو رات تک اس ہی کی زمینوں سے گزرتی رہتی ہے۔ پہلے اپنی زمینیں بانٹے نا۔[۲۷]

بھٹو کی یہی سب سے بڑی کمزوری تھی جسے ان کے مخالفین ان کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ وہ عوام میں اس شعور کو پروان چڑھانے کی کوشش میں تھی کہ بھٹو جاگیرداروں پر ہاتھ ڈالنے اور ان کی جاگیریں عوام میں تقسیم کرنے کی بات کرتا ہے لیکن خود جاگیردار ہے۔ اگر وہ عوام سے کیے گئے وعدوں میں مخلص ہے

تو اس کی ابتدا اپنی ذات اور اپنے گھر سے کرے اور اپنی جاگیر بے زمین کسانوں میں تقسیم کرے۔ اس بات میں وزن بھی تھا اور یہ بھی حقیقت سامنے آ رہی تھی کہ بھٹو کا یہ سیاسی نکتہ کامیاب ہونے والا نہیں ہے۔ کیوں کہ جاگیر دار طبقے کا اثر و رسوخ اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ اکیلا بھٹو ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا۔ دوسری طرف ایک حقیقت یہ بھی بھٹو کے دور میں صنعتوں کو قومیانے کا جو عمل شروع گیا تھا اس نے بھی بھٹو کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ ملکی معیشت پر بھی منفی اثرات مرتب کیے تھے۔ اگرچہ بھٹو کا یہ عمل صنعت اشرافیہ کے استحصال سے نجات دلانے کا عمل تھا تاہم اس کے نتائج زیادہ مفید نہ نکلے تھے۔ اس عمل میں ناکامی اور اس کے مضر اثرات کو جانتے ہوئے بھٹو جاگیر داری نظام پر ہاتھ ڈالنے سے بھی کتراتے رہے۔ طاہرہ اقبال کے ناول نیلی بار میں بھی اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ بھٹو کا صنعتوں کو قومیانے کا عمل درست نہیں تھا اور اس کے نقصان کی وجہ سے ہی بھٹو جاگیر داروں کے خلاف کوئی اقدامات نہ کر سکا۔ طاہرہ اقبال بھٹو کی مقبولیت کے باوجود بھٹو کے عہد میں عوام کی حالت اور بھٹو کی سیاست کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتی ہیں:

> یہ پبلک تو ایندھن ہے وہ لکڑیاں جو اقتدار کی دیگ کے نیچے جھونکی جاتی ہیں، وہ کندھے جو جیتنے والے کو خود پر سوار کرواتے ہیں۔ وہ حلق جو نعرے لگانے کے لیے کرائے پر لیے جاتے ہیں کون ان سے اتنا کام لے سکتا ہے یہ سیاستدان کی کوالٹی ہے۔ پھر بھٹو نے صنعتوں کو لٹوا کر سبق سیکھ لیا ہے۔ اسی لیے تو زمینوں کی طرف دیکھا تک نہیں۔[۲۸]

بھٹو کے دور کی سیاست اور اس سیاست میں عوام کے کردار اور مرتبے کے حوالے سے طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں خوب بحث کی ہے۔ بھٹو کے سیاسی اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا جائے تو اگرچہ شروع میں انھوں نے بہت سے انقلابی اقدامات کیے۔ اس ملک کو آئین دیا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے وقت قید ہونے والے فوجیوں کو کامیاب مذاکرات کے ذریعے چھڑا کر پاکستان لایا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات پر ان کی گرفت کمزور پڑتی چلی گئی اور وہ مصلحت کا شکار ہوتے چلے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ مخالفین کو زیر کرنے کے لیے طرح طرح کے حربے بھی ان کے مزاج کا حصہ بنے جو آگے چل کر اس ملک کے سیاسی منظر نامے کو مکدر کرتے چلے گئے۔ حقی حق اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ذوالفقار علی بھٹو نے بلاشبہ بہت محنت، جانفشانی اور تن دہی سے پاکستان کی تعمیر نو کا آغاز کیا۔ شروع شروع میں ان کے لفظوں اور لہجے سے اخلاص کی بو آتی تھی۔

لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان کی کایا پلٹ گئی ۔ ان کے افعال پر آئی ، چلائی ، چھینا جھپٹی، غیر جمہوری رویئے، مک مکا اور مصالحت کا رنگ غالب آگیا۔[۲۹]

اس بدلتے ہوئے منظر نامے میں عوام میں بھی یہ شعور بیدار ہونے لگا تھا کہ پہلے حکمرانوں کی طرح بھٹو کے دور میں بھی عوام کا کام صرف ان لوگوں کو اقتدار کے ایوانوں تک پہنچانا رہ گیا ہے۔ عوام کے بنیادی مسائل سے چھٹکارہ اب بھی ممکن نہیں ہے۔ قول و فعل کے تضاد نے ایک بار پھر عوام کو اسی دلدل میں لا کھڑا کیا ہے جس سے نکلنے کے وہ خواب دیکھ رہے تھے۔ طاہرہ اقبال عوام کے اس سیاسی شعور کا نقشہ کھینچتے ہوئے ناول نیلی بار میں لکھتی ہیں:

> یہ سیاستدان بھی رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ تم صرف زار افتح شیر نہیں ہو اس نظام کا چہرہ ہو۔ اس سسٹم کا پورا تعارفیہ ہو۔ تم اپنے کمزور لمحوں میں ان کیڑے مکوڑوں کا استعمال تو ضرور کرتے ہو ان کا معجون بھی تقویت کے لیے بناتے ہو۔ ان کا مرہم بھی دکھتے اعضا پر رکھتے ہو، لیکن انھی کا سر کچلنے کے لیے آہنی بوٹ بھی پہن رکھتے ہو کہ یں کوئی اپنی حد سے تجاوز نہ کر جائے ۔ یہی عمل اب کی بار پھر دہرایا گیا ہے، پھر سیاست جیت گئی اور عوام ہار گئے ۔ پھر ایک جاگیر دار کے شاطر دماغ نے عوام الناس کو اب راج کرے گی خلقِ خدا کا جھانسہ دے کر انھیں جیت کا احساس دلا کر اس حد پر روک دیا جو اس سسٹم نے صدیوں سے متعین کر رکھی ہے۔[۳۰]

بھٹو کے دور میں عوام میں جو احساس محرومی پیدا ہوا اس میں دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ خود بھٹو کا کردار بھی نمایاں تھا۔ بھٹو کو عوام ایک نجات دہندہ کے طور پر حکمرانی تک لائے تھے لیکن جب وہ مصلحت کا شکار ہوئے تو ملکی حالات ان کے ہاتھ سے نکلتے چلے گئے ۔ جس کی وجہ سے عوام براہ راست متاثر ہوئے ۔ اس سلسلے میں اپریل ۱۹۷۵ء کی ایک تحریر بھٹو دور کے حالات کا بہترین تجزیہ کرتی ہے۔ صفدر حسین صدیقی اس دور کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ملک کے حالات مسلسل بگڑتے چلے جا رہے ہیں۔ عوام کا حکومت کرنے کا جمہوری اختیار چھینا جا چکا ہے۔ شہری آزادیاں سلب کی جا چکی ہیں۔ حکومت پر قابض لوگ من مانی کاروائیوں میں مصروف ہیں۔ کمر توڑ مہنگائی مسلط کر کے عوام کی زندگی دوبھر کر دی گئی ہے۔ ملک کی دولت کو فضول خرچیوں اور حاکمانہ ٹھاٹھ باٹھ پر ضائع کیا جا رہا ہے۔ ملک کی ہمہ جہتی پیداواری ترقی رک گئی ہے ریاست کی آمدنی

کا اسی فی صد دفاع کے نام پر غیر پیداواری کاموں میں صرف کیا جارہا ہے۔ عالمی سامراج کے ساتھ فوجی معاہدوں کے ذریعے ملکی سالمیت کو خطرے میں ڈال دیا گیا ہے۔ عوامی حاکمیت کے اداروں اسمبلیوں اور سینٹ کو عضو معطل بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ملک کے دستور کی پابندی کرنے کی بجائے اس کی دھجیاں بکھیری جارہی ہیں۔[۳۱]

جب ایسے حالات ہوں تو عوام میں احساس محرومی پیدا ہونا لازمی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ بھٹو جب مصلحت کا شکار ہوئے تو ان کی زیادہ توجہ ملکی مسائل کی بجائے مخالفین کو دبانے کی طرف ہوگئی جس کی وجہ سے عوام مسائل میں دھنستے چلے گئے۔ عوام میں اس عہد میں جو احساس محرومی پیدا ہوا اس سے یہ سامنے آنے لگا کہ عوام کو بھٹو کے روپ میں جو مسیحا نظر آرہا تھا وہ بھی اسی روش میں بہتا جارہا ہے جو قیام پاکستان کے بعد سے جاری ہے۔ طاہرہ اقبال عوام کی محرومی کو یوں آشکار کرتی ہیں کہ "کتنا رولا مچا بدل جائے گا۔ بھٹو سب بدلنے آیا ہے بھلا کچھ بدلا۔ دان خاندان کبھی بدلے۔ چوہڑے چمار کبھی بدلے۔[۳۲]

بھٹو کے آنے بھی غریب اور امیر کے درمیان پائی جانے والی خلیج اور طبقاتی امتیاز کسی طرح نہ ختم ہو سکا نہ کم ہو سکا۔ اس کی عکاسی نیلی بار میں یوں کی گئی ہے:

یہ بھٹو کیا ہے ایک احساس۔ ایک سوچ ہے آزادی اور حق کی علامت بس۔۔۔
ورنہ غریب تو پہلے جیسا غریب رہا اور امیر پہلے سے زیادہ امیر ہوگیا۔ وہی پیوند جڑے چیتھڑے وہی بھوک مارے ڈھانچ۔ وہی ذلت اور بے عزتی۔[۳۳]

بھٹو کا زوال اسے نہ صرف اقتدار سے دور لے گیا بلکہ زندگی کی قید سے بھی آزاد کرنے کا سبب بنا۔ بھٹو کی پھانسی ایک طرف عدالتی نظام پر بہت بڑا سوالیہ نشان لگاتی ہے تو دوسری طرف تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ بھٹو کی پھانسی سے عوام میں بھٹو کی مقبولیت بھی سامنے آئی۔ یہاں اگر غیر جانبدارانہ انداز میں تجزیہ کیا جائے تو بھٹو کی پھانسی سے عوام اس کے اچھے کارناموں کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ہونے والی اس بڑی زیادتی کی وجہ سے ہمدردی بھی پیدا ہوئی تھی۔ دوسری طرف ضیاء الحق نے چوں کہ جمہوری نظام کو لپیٹ دیا تھا اس وجہ سے جمہوری سوچ رکھنے والے افراد اسے غاصب سمجھتے تھے اور اس کے دور میں بھٹو کی پھانسی کو ضیاء الحق کے ہاتھوں بھٹو کے قتل سے تعبیر کیا گیا۔ بھٹو کی پھانسی پر عوامی جذبات کی عکاسی نیلی بار میں یوں کی گئی ہے:

"ہائے بھٹونوں مار گھتیو نیں۔"۔۔۔۔۔ حال اوئے پھاہی لگ گیا۔ یہ بادشاہیاں
بڑی ظلمی کیا پتہ کب تخت تختہ بن جائے۔ تخت پر کانا دجال آ بیٹھا۔ ہائے مار دیا
بھٹو پھاہی چڑھا دیا تو میں کو پوچھنے والا غریب کا جھالو۔ ہائے مار دیا۔[۳۴]

بھٹو کے اس قوم پر بڑے احسانات تھے خاص طور پر فوج کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بھٹو ہی تھا جس نے سقوط ڈھاکہ کے بعد ہندوستان میں قید ہو جانے والے فوجیوں کو نکالنے کے لیے کامیاب مذاکرات کیے اور بیک جنبش قلم ہزاروں فوجی قیدیوں کو رہائی دلانے میں کامیاب ہوا۔ یہ بھٹو کی ایسی کوشش تھی جس کا اعتراف اس کی زندگی میں ہر چھوٹا بڑا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آمریت نے بھٹو کو موت کے گھاٹ اتارا تو عوام میں ایک تاثر یہ بھی گیا کہ وہ فوج جس کو بھٹو نے بچایا تھا۔ جسے بھٹو قید سے نکال کر لایا تھا اسے بھٹو کا احسان مند ہونا چاہیے تاکہ مگر اس نے احسان مندی کے بجائے الٹا بھٹو صاحب کو ہی دار پر لٹکا دیا۔ طاہرہ اقبال ناول نیلی بار میں تاریخ کا حصہ بنے ہوئے ان عوامی جذبات کی عکاسی یوں کرتی ہیں کہ رقیہ بیگم دونوں ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے دہائی دیتی تھیں۔" ہائے جو قید سے چھڑوا کر لایا اس کو خود ہی انھوں نے مار دیا"۔[۳۵]

بھٹو کی پھانسی کو عوام نے کسی طور قبول نہ کیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مارشل لاء کے جبر کی وجہ سے عوام کو اپنی رائے کے اظہار کا وسیع موقع نہ مل سکا لیکن عوام کے دل میں ملکی تاریخ کے اس واقعے نے گہرے زخم پیدا کر دیے۔ ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کہ ذاتی مفادات میں کوئی اس حد تک بھی بڑھ سکتا ہے کہ کسی کی جان بھی لے لے۔ نیلی بار میں بھٹو کی پھانسی کے بعد عوامی جذبات کی عکاسی یوں کی گئی ہے:

ہائے بھٹو پھاہے لگا، ریاستوں کا مہاراجہ، جہاں تھوکے چاٹنے والے ہزاروں
پیر رکھے وہاں ہاتھ دھرنے والے ہزاروں، ہائے سندھڑی دا شہزادہ۔۔۔ ہائے
تیرا غم ہیچ وجودنوں کھا گیا جویں سیخ درخت نوں۔۔۔ ہائے جویں پنوں باج سسی
تھلاں اچ کرلاوے۔۔۔ ہائے اس بار غم کا آسمان ایسا پھٹا کہ سینے دق کے مرض
سے چھید وچھید۔۔۔ ہائے ہم جوانی میں بڈھیاں ہو گئیں، عمر ہنڈا کے نہ
دیکھی۔[۳۶]

ان عوامی جذبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ بھٹو کو عدالت کے حکم پر پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی لیکن اس وقت کی عوام بھی جانتے تھے کہ یہ عدالتی فیصلہ تخت پر بیٹھے آمر کے حکم سے ہی لکھا گیا ہے۔ طاہرہ

اقبال نے اس ناول میں تاریخ کو سموتے ہوئے ان عوامی جذبات کو بڑی دلیری سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ قاری اس ناول کو پڑھتے ہوئے پاکستانی تاریخ کے اس اہم دور کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کرنے لگتا ہے۔

جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا میں سماجی سطح پر بغاوت کو دبانے اور عوام کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے فوجیوں کی نقل و حرکت شہروں اور دیہاتوں کے اندر تک بڑھ گئی تھی۔ ایسا عموماً حالتِ جنگ میں ہوتا جب ملکی دفاع کے لیے فوج شہروں اور دیہاتوں میں بھی نظر آنے لگتی ہے لیکن اب کی بار کوئی جنگی صورت حال بھی نہیں تھی اس کے باوجود فوجی اپنے ہی ہم وطنوں کو دبانے کی خاطر ہر جگہ گھوم رہے تھے۔ طاہرہ اقبال اس صورت حال کا نقشہ نیلی بار میں یوں کھینچتی ہیں:

> وہی اب بنا کسی جنگ اور آفت کے شہروں اور قصبوں میں پھیل گئے تھے۔ یہ نایاب اور خاص الخاص عام ہو کر اپنا طلسم کھو رہے تھے۔ کیا اس لیے قوم اپنا پیٹ کاٹ کر ان میں آہن بھرتی ہے کہ یہ اپنی بندوقوں اور بوٹوں سے انھی عوام کے گھروں اور سڑکوں کو محصور بنالیں، جس کو چاہیں سنگین کی نوک پر دھر لیں یہ سوال زیرِ زباں تھا۔ یہ اپنے منصب سے اس قدر نیچے کیوں اتر آئے۔ ان سے وہ سب کچھ کیوں کروایا گیا جس سے ان کی شخصیت کا طلسم ٹوٹ گیا۔[۳۷]

اس اقتباس سے جنرل ضیاء الحق کے دور میں فوج کے خصوصی مرتبے سے اس کے عمومیت میں بدلنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وہ دور تھا جس میں اسلام کے نام پر عوام کو گمراہ کرنے کا سلسلہ نہ صرف شروع ہوا بلکہ عروج کو بھی پہنچا۔ اسی دور میں ایک طرف پاکستان میں اسلام کے نام پر جنرل ضیاء الحق اپنے اقتدار کو طول دے رہا تھا تو دوسری طرف روس گرم پانیوں تک رسائی کے لیے افغانستان میں قدم جما رہا تھا۔ روس کی بڑھتی ہوئی یلغار کے سامنے بند باندھنے کے لیے اسی دور میں افغان جہاد شروع ہوا۔ افغان کے مجاہدین نے روس کے سامنے مزاحمت شروع کی اور ان مجاہدین کو اسلحہ اور مالی امداد سمیت ہر طرح کی امداد امریکہ نے پاکستان کے ذریعے پہنچائی۔ جس کے نتیجے میں افغان جہاد کامیاب ہوا اور روس شکست وریخت کا شکار ہو کر اپنا وجود بھی برقرار نہ رکھ۔ افغان جہاد نے اس خطے اور خاص طور پر پاکستان کی سیاست اور سماج کو خاصا متاثر کیا۔ ریاض احمد شیخ اس جہاد کے پاکستانی سماج اور سیاست پر اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ضیا کی افغان پالیسی کے باعث ملک میں انتہا پسندی اور فرو ہی مسائل کو مزید بڑھنے کا موقع ملا۔ افغان مہاجرین کو پاکستان میں پناہ دیتے وقت اس بات کا خیال نہ رکھا گیا کہ انھیں ان کی پناہ گزین خیمہ بستیوں تک محدود رکھا جائے تاکہ یہ پورے ملک میں نہ پھیل سکیں۔۔۔۔ جنرل ضیا کے دور میں آئی ایس آئی نہ

صرف افغان جہاد میں مصروف رہی بلکہ اس نے ملک کی اندرونی سیاست میں بھی
کلیدی کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔[۳۸]

افغان جہاد میں جہاں افغانستان سے تعلق رکھنے والے افغانیوں نے حصہ لیا وہاں پاکستان سے بھی مجاہدین وہاں بھیجے جاتے تھے۔ ان مجاہدین کی تربیت اور ان کے گھر والوں کی مالی امداد کا بھی انتظام کیا جاتا تھا تاکہ روس کو شکست سے دوچار کیا جائے۔ اس سارے عمل میں امریکہ نے جو کردار ادا کیا اس سے پاکستان کی معیشت کچھ سنبھلی ضرور لیکن اس کے نتیجے میں ملک میں اسلحہ اور منشیات بھی سماج میں پھیل گئیں۔ افغان جہاد کے لیے باقاعدہ مساجد اور مدارس سے بھرپور کام لیا گیا۔ اسلامی تعلیم کے ان مراکز کو جہادی مراکز میں تبدیل کر دیا جن سے سماج میں باقاعدہ اس جہاد میں حصہ لینے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار عصری تاریخ کی عکاسی کرتے ہوئے افغان جہاد کے وقت سماج میں اس جہاد کی پکار کی عکاسی یوں کرتا ہے:

اے اسلام کے کم ہمت سپوتو! تمہیں کشمیر، فلسطین اور افغانستان کی مٹی مدد کے لیے پکار رہی ہے، جو ظالموں، غاصبوں اور کافروں کے ناجائز قبضہ میں ہے، جہاں اسلام شدید خطرات میں گھر چکا ہے، جہاں مسجدیں ڈھائی جا رہی ہیں۔ قرآنِ پاک کے نسخے جلائے جا رہے ہیں۔ کلمہ گو شہید کیے جا رہے ہیں۔ پاکباز بہنوں کی عزتیں تار تار کی جا رہی ہیں۔۔۔۔۔۔ کہاں ہیں آج شہادت کے طلب گار، کہاں ہیں اسلام کے مجاہد۔"

"لبیک لبیک۔"

کی صداؤں سے کان پھٹے جاتے تھے، جیسے ہر ایک ابنِ قاسم، ابن زیاد پکار اٹھا ہو، "حاضر حاضر حاضر ہوں۔[۳۹]

اس جہاد کے سلسلے میں روس تو شکست سے دوچار ہوا لیکن اس کے مابعد اثرات نے پاکستانی سماج کو بھی خاصا متاثر کیا۔ اس کے اثرات اب بھی پاکستانی سماج پر موجود ہیں۔ اس جہاد میں حصہ لینے اور ملک میں اسلام کے نام پر مختلف اقدامات کرنے کی وجہ ضیاء الحق کو اس کے رفقا کے نزدیک امیر المؤمنین کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس عہد میں اسلام کے نام پر بہت کچھ کیا گیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے محض نام کو ہی استعمال کیا گیا تھا ورنہ حقیقت میں سماج کو اسلام کی طرف لانے کی کوئی مضبوط کوشش نہ کی گئی۔ تمام اقدامات محض رسمی اقدامات یا دفاتر میں نماز کی صف بندیوں تک ہی محدود تھے۔ ضیاء الحق اپنی حکمرانی کے اس نشے میں آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ ان کا وقت اجل آن پہنچا اور وہ ان عالمی طاقتوں

جن کی خوشنودی کو مقدم سمجھتے تھے کے نمائندوں کے ساتھ ہی ہوا میں تحلیل ہوگئے۔ طاہرہ اقبال نیلی بار میں اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ "طیارہ کریش ہوگیا۔ امیر المؤمنین ہزاروں زرّوں میں تحلیل ہو کر کہیں آسمانی جنتوں کو پرواز بھر گیا۔"[۴۰]

جنرل ضیاء الحق کے اس حادثے اور موت سے چند سال پہلے بے نظیر بھٹو جلاوطنی ختم کر کے ملک واپس آچکی تھیں اور جمہوریت کی بحالی کے لیے دیگر جماعتوں کے ساتھ مل کر اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے تھیں۔ محمد خان جونیجو کی حکومت کو ختم کرنے کے بعد جب جنرل ضیاء الحق نے انتخابات کا اعلان کیا تو ملک میں سیاسی سرگرمیاں ایک بار پھر پروان چڑھیں اور ملک کی فضا میں الیکشن کا شور بلند ہوا۔ اسی دوران میں طیارہ حادثہ کے دوران ضیاء الحق کی موت سے سیاسی منظر نامہ بدل گیا اور غلام اسحاق خان جو اس وقت چیئر مین سینٹ تھے انھوں نے آئینی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کرسی صدارت بھی سنبھال لی اور ہنگامی طور پر فوج کے سربراہ جنرل اسلم بیگ اور دیگر فوجی اور سویلین افراد پر مشتمل تیرہ رکنی ہنگامی کونسل کا اعلان کر دیا جو وفاقی کابینہ کا متبادل تھی۔ اس کے بعد ۱۹۸۸ء میں انتخابات ہوئے تو عوام نے بھٹو کی پھانسی کے خراج کے طور پر بے نظیر بھٹو کو ووٹ دیے۔ ملک کے طول و عرض میں بے نظیر کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ طاہرہ اقبال بے نظیر کے اقتدار میں آنے کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

> اور آج دنوں بعد یہ عجیب خبر لگی تھی کہ بھٹو کی بیٹی الیکشن جیت گئی۔ حبس بھری قد آور فصلوں میں سے جڑی بوٹیاں کھودتی عورتوں نے پیشانی پر بندھی پشت پر لٹکتی جھولی کی مضبوط گرہ کو سر کی پچھلی سمت دھکیلا اور گھاس بھری جھولیاں کھال میں الٹ دیں۔
>
> "ہائے جنوں تختے چاڑھیا اج اوہدی بیٹی تخت تے آبیٹھی پاک استان دی بادشاہ بن گئی ہائے نی بابے دلی لاڈلی ملکاں دی شہزادی نی ریاستاں دی رانی سوہنی سونکھڑی شہزادی نذیر بابے دی گدی تے آبیٹھی۔"[۴۱]

بے نظیر بھٹو نے جب مسند اقتدار سنبھالی تو اس وقت ایک طرف ملک میں ضیاء الحق دور کے اسلامانائزیشن کے اثرات بھی موجود تھے دوسری طرف وہ سیاسی پارٹیاں جو پیپلز پارٹی کے خلاف تھیں وہ بھی محاذ سنبھالے ہوئے تھیں۔ اس دور میں بے نظیر کے خلاف عوام میں جو سوچ پروان چڑھانے کی کوشش کی گئی اس پر بھی اسلامی لبادہ اوڑھایا گیا اور یہ تاثر دیا گیا کہ اسلام میں عورت کی حکمرانی جائز نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بے نظیر کو امریکی ایجنٹ کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ اس دور کی سیاسی چالیں تھیں جنھیں طاہرہ

اقبال نے بھی نیلی بار میں بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو کہ بے نظیر کی مخالفت کن خطوط پر ہو رہی تھی:

"ملکانی جی سنا بھٹو کی بیٹی پاکستان کے تخت پر بیٹھ گئی۔"

"ہاں رحمتے! کوئی حال رہ گیا اس اسلامی ملک کا۔۔۔ کل کی چھوکری نہ اللہ رسول کا نام آئے نہ نماز روزے کا پتہ ساری عمر انگریزوں کے دیس میں گزاری ۔۔ پاکستان میں مردوں کی نسل ختم ہوگئی ہے نا جو یہ۔۔۔ آدھی انگریز آدھی ایرانی۔۔۔ نری کافرستانی۔۔۔ امریکہ کی سازش ہے نا ساری امریکہ کی۔۔ کہ اس اسلامی ملک میں لادینی پھیلے۔[۴۲]

اس اقتباس سے واضح ہوتا کہ اُس دور میں سیاست کو سماج میں کس طرح پھیلایا جارہا تھا اور سیاسی مخالفین کے بارے میں کس طرح کے گمراہ کن تصورات سماج میں رائج کیے جارہے تھے۔ نیلی بار میں طاہرہ اقبال نے بڑی تفصیل سے اس عوامی سوچ کو نمایاں کیا ہے جس کے نزدیک بے نظیر کا عورت ہونا ایسا بڑا گناہ تھا جو اسے حق حکمرانی سے روکتا تھا۔ یہ سب بھی ایک سوچے سمجھے منصوبے کے ذریعے پھیلایا گیا تھا۔ یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ایسی سوچ کو پروان چڑھانے میں وہی طبقہ اشرافیہ پیش پیش تھا جو اس ملک کی حکمرانی میں حصہ دار ہوتا ہے۔ وہی جاگیر دار اور سرمایہ دار۔ ورنہ عوام میں بے نظیر کی فتح عوام کی فتح ہی گنی جاتی تھی، اور بے نظیر کے روپ میں انھیں دوبارہ بھٹو ملتا محسوس ہوا تھا۔

بے نظیر بھٹو حکمران تو بن گئیں لیکن مخالفین کو ان کی کامیابی کسی طور ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شروع دن سے ہی ان کے خلاف محاذ کھول لیا گیا۔ بے نظیر بھٹو کے خلاف بنائے گئے محاذ کی کارستانیوں پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر شاہد نواز لکھتے ہیں:

بظاہر پاکستان پیپلز پارٹی کو عوام کی رائے کو مد نظر رکھتے ہوئے حکومت بنانے کا اختیار دے دیا گیا۔ مگر روزِ اوّل سے اس کے خلاف سازشوں کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ کبھی متحدہ اپوزیشن کا ڈول ڈالا گیا تو کبھی حکومت کے کاموں میں مداخلت برتی گئی۔ حیرت انگیز طور پر یہ کام خفیہ ہاتھوں نے سیاست دانوں کے ذریعے کیا۔ سیاست دان طویل مارشل لائی دورانیے سے سبق نہ سیکھ سکے اور آلہ کار بنتے رہے۔[۴۳]

بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خلاف سازشوں اور چالبازیوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور آخر کار ۱۶ اگست ۱۹۹۰ء کو اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کو برطرف کر دیا۔ اس برطرفی کے

جواز میں بے نظیر بھٹو پر جو الزامات لگائے گئے ان میں ہارس ٹریڈنگ، کرپشن، اقربا پروری، انتظامی نااہلی، آئینی بے ضابطگیاں، رشوت، اعلیٰ عدالتوں اور سینٹ کی تضحیک شامل تھے۔

بے نظیر بھٹو کی حکومت پر جو الزامات لگائے گئے ان کے درست یا غلط ہونے سے قطع نظر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس حکومت کو گرانے میں توانا عناصر وہ بھی تھے جن کی وجہ سے فوج اور حکومت کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ ان اختلافات نے حکومت گرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں احمد سلیم لکھتے ہیں:

> مسئلہ صرف داخلی اختلافات اور ڈس انفارمیشن کا نہیں تھا۔ اس عرصہ میں پیپلز پارٹی اور فوج کے درمیان گہرے سیاسی اختلافات بھی پیدا ہو چکے تھے۔ کشمیر، ہندوستان، افغانستان، سندھ کے علاقے بھی سٹریٹیجک مسائل بھی صورت پر اپنے گہرے اثرات مرتب کر رہے تھے۔[۴۴]

حالات کے اس نہج پر پہنچنے کا نقصان بے نظیر بھٹو کو اٹھانا پڑا اور ان کو اس حکومت سے محروم ہونا پڑا جس کے لیے وہ جلاوطنی ختم کر کے پاکستان واپس آئی تھیں اور جس کی خاطر انھوں نے قربانیاں دی تھیں۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کو طاہرہ اقبال نیلی بار میں اس طرح بیان کرتی ہیں کہ عوام کی ہمدردیاں اس موقع پر بھی بے نظیر بھٹو کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طاہرہ اقبال کو نہ صرف تاریخ کو ادب کا حصہ بنانے کا فن آتا ہے بلکہ وہ تاریخی واقعات کے سماج پر پڑنے والے اثرات کو بھی بڑی مہارت سے ادبی پیرائے میں بیان کرنے پر قدرت رکھتی ہیں۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے پر عوامی ردعمل جو گاؤں کی عام عورتوں کی زبانوں پر تھا اس کی عکاسی طاہرہ اقبال یوں کرتی ہیں:

> بھٹو کی بیٹی کی حکومت گرادی گئی ہے۔ اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں۔ عورتیں دونوں ہاتھوں سے سینوں کو کوٹتی اور پتھر مشقتی ہتھیلیاں باہم رگڑتی دل کلیجے کے ٹکڑے بینوں میں اگلتی تھیں۔[۴۵]

بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کا جواز پیدا کرتے ہوئے کرپشن اور لوٹ مار کے الزامات بھی لگائے گئے۔ یہ ایسے الزامات تھے جنھوں نے بے نظیر اور بھٹو کے چاہنے والوں کو دکھی بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایسے الزامات کی وجہ سے ان کی حکومت گرائی گئی تو عوام میں جو ردعمل سامنے آیا اس میں ان الزامات کی مخالفت بھی نمایاں تھی۔ عوام یہ ماننے کو تیار نہ تھی کہ بے نظیر نے لوٹ مار کی ہے یا کرپشن کی ہے۔ طاہرہ

اقبال بے نظیر حکومت کے خاتمے کے بعد عوام کی طرف سے اس رد عمل کی عکاسی گاؤں کی عورتوں کی زبانی یوں کرتی ہیں:

> ہائے وے ربا شالا کوڑی ہو کر مریں، انھیں کیڑے پڑیں۔ بابے کو سولی چڑھا کر کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا کہ یتیم بچی پر کیسے کیسے الزام لگائے۔ وہ کیوں کسی کا کھاتی۔ اللہ کا دیا ہوا اس کے پاس ڈھیر۔ اتنا کی آپ بوہوں باہر ہو بیٹھے۔ گاڑی چار پہر چلتی رہے تو بھی بابے کی جاگیر کبھی ختم نہ ہو۔[۴۶]

بے نظیر بھٹو کی حکومت کے خاتمے کے بعد انتخابات کا اعلان ہوا۔ ملک میں انتخابی سر گرمیاں شروع ہوئیں۔ اس بار پاکستانی سیاست میں نواز شریف ایک توانا کردار کے طور پر داخل ہوئے (حقیقت میں داخل کیے گئے) اسلامی اتحاد کے نتیجے میں نواز شریف وزیر اعظم بنے لیکن دو سال کا عرصہ گزارنے کے بعد ہی ملکی سیاست کی اسی روش کا شکار ہو گئے جو شروع دن سے جاری تھی اور نواز شریف کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ نواز شریف کی بر طرفی عدالت نے ختم کر کے بحال کر دیا تو ان کے صدر کے ساتھ اختلافات بڑھتے دیکھ کر فوجی حکمران درمیان میں مصالحتی کے لیے آئے اور آخر کار نواز شریف نہ صرف خود حکومت سے علیحدہ ہوئے بلکہ اپنے ساتھ صدر کو بھی ڈبوتے چلے گئے۔ انتخابات ہوئے۔ اس بار عوام نے ایک بار پھر بے نظیر بھٹو پر اعتماد کیا اور وہ دوسری بار وزارت عظمی کے عہدے پر فائز ہوئیں لیکن ملکی سیاست اور محلاتی سازشوں کا شکار ہو کر وہ بھی مدت پوری کرنے سے قبل ہی اقتدار سے الگ کر دی گئیں۔ عوام نے بے نظیر کی دوسری بار کی بر طرفی کو بھی قبول نہ کیا۔ بے نظیر کے چاہنے والوں کے جذبات کی عکاسی ناول نیلی بار میں یوں کی گئی ہے کہ عوام کے ذہنوں میں یہ خیال پروان چڑھ رہا تھا کہ بے نظیر کو عالمی طاقتوں نے حکومت سے الگ کیا ہے۔ طاہرہ اقبال بے نظیر کی بر طرفی پر عوامی سوچ کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

> ہوا کے سنگ سنگ اڑنے والے سیم وزر کا چوگا چگنے لگے۔ گاؤں والوں کو تو بس اتنا پتا چلا کہ بھٹو کی بیٹی دو بار پاکستان کے تخت پر بیٹھی تھی لیکن جونہی وہ غریبوں، مسکینوں کو زمینداروں، امیروں کے ظلم سے نجات دلانے کے قریب ہوئی تھی۔ اسے تخت سے اتار پھینکا گیا۔ وہ ملکوں وڈیروں سے مربع اور حویلیاں چھین کر مزارعوں اور کمیوں میں بانٹنے کو ہی تھی کہ اوپر کہیں خبر لگ گئی امریکہ کو خبر پہنچ گئی بھلا اوپر والے نیچے والوں کا فائدہ کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ بس اتار پھینکا اسے۔[۴۷]

بے نظیر پر جو الزامات لگائے گئے نواز شریف اوراس کے حریفوں نے اپنی انتخابی مہم میں ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک میں ہر طرف نواز شریف کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔اس شہرت کے پیچھے نواز شریف سے زیادہ وہ خفیہ ہاتھ تھے جو نواز شریف کو لانے والے تھے۔ ورنہ حقیقت یہ تھی کہ عوام اب بھی بے نظیر سے محبت کرتی تھی اور اس پر جان چھڑکتی تھی۔ طاہرہ اقبال نے نواز شریف کی انتخابی مہم اور عوامی جذبات کی عکاسی یوں کی ہے:

> "دیکھو دیکھو، کون آیا، شیر آیا شیر آیا" نعرے تھے کہ جیسے واقعتاً شیر دھاڑ رہا ہو۔ جلیبیوں کے انتظار میں بیٹھے افراد کا جی چاہتا تھا کہ تیر کے نشانے لے کر شیر کو چھید و چھید کر دیں۔[۴۸]

ان انتخابات میں بہت سے ایسے عناصر بھی ملکی سیاست کا حصہ بنے جو کبھی سیاسی منظر نامے پر نمودار بھی نہ ہوئے تھے۔ وہ لوگ جو گلی محلے کی سیاست کے عناصر تھے اور زیادہ سے زیادہ سیاسی لوگوں کی ہاں میں ہاں ملانے والے تھے، انھیں بھی اسمبلیوں تک رسائی ہوئی اور وہ الیکشن میں بڑے بڑے سیاست دانوں کو شکست دے کر ایوانوں تک پہنچ گئے۔ یہ الیکشن نواز شریف کو جتانے سے زیادہ بے نظیر کو ہرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو بھی سامنے لانے گیا جو کسی طرح بھی سیاسی منظر نامے کا حصہ نہ تھے۔ طاہرہ اقبال اس صورت حال کی عکاسی ناول نیلی بار میں یوں کرتی ہیں:

> بھائیو! کل جگ ہے۔ خاندانی سیٹیں چھن رہی ہیں۔ بدنسلے حاکم ہو رہے ہیں۔ کبھی یہ ظلم ہوا کہ خاندانی جاگیریں لٹ جائیں پر آج لٹ گئی ہیں۔ بے جڑ بے بنیاد جو کل اجڑ کر آئے وہ آج پاکستان کے تخت پر بیٹھ رہے ہیں۔۔۔۔ یہ جو کل تک ہمارے حقے بھرتے اور زمینیں کاشت کرتے نوکر مزارعے تھے آج ہمارے مقابلے میں جیت کا جشن منا رہے ہیں۔ عربی ریاستوں کی آمدنی آئی ہے کہ کمینہ خون بھٹی چڑھ گیا ہے۔[۴۹]

نواز شریف کی جیت نے ملک کے سیاسی منظر نامے کو کئی حوالوں سے بدل کر رکھ دیا۔ ایک طرف نچلے طبقے اور گلی محلے کی سیاست کے عناصر ایوانوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے یا کامیاب کروائے گئے تو دوسری طرف ملکی سیاست میں جاگیرداوں کے ساتھ ساتھ سرمایہ دار طبقہ کا عمل دخل بھی حقیقی معنوں میں اسی دور میں شروع ہوا۔ یہی وہ دور تھا جب ملکی سیاست جاگیرداری نظام سے نکل کر سرمایہ دارانہ اور صنعتی نظام کے کارندوں کے ہاتھوں میں گئی۔ طاہرہ اقبال نے اپنے سیاسی شعور کی بدولت ملکی سیاست میں آنے والی

اس تبدیلی کو بھی بڑی وضاحت سے ادب کا حصہ بنا کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ وہ نواز شریف کی جیت کے بعد ملک کے سیاسی منظر نامے پر ہونے والی اس تبدیلی کو یوں سامنے لاتی ہیں:

> اقتدار کا ہما جاگیروں سے اڑ کر صنعتوں کی مشینوں کے سر پر بیٹھ گیا۔ اب تو شیر چنگھاڑ رہا تھا۔ جس کی چنگھاڑ پورے ملک میں سنائی دیتی تھی جس میں سے مینڈیٹ مینڈیٹ کی صدا نکلتی تھی۔ زمینیں انھی کے نام رہیں جن کے نام انگریز کے زمانے میں کبھی لگی تھیں۔ لیکن پہلی بار یہ حادثہ ہوا کہ اقتدار کا دھارا زمینوں، جاگیروں سے ملوں، فیکٹریوں کی طرف مڑ گیا۔ فوجیوں اور جاگیرداروں کے علاوہ ایک تیسری مقتدر قوت سامنے آئی جو صنعت کار تھی۔[۵۰]

اس بار نواز شریف دو تہائی اکثریت سے وزیر اعظم بنا۔ دو تہائی مینڈیٹ ملتے ہی نواز شریف نے خود کو کسی اور جہاں کی مخلوق تصور کرنا شروع کر دیا اور اس مینڈیٹ کی زد میں جو بھی آیا اسے روندتا چلا گیا۔ شاہد نواز، نواز شریف کے دوسرے دورِ حکومت میں ان سے ہونے والی کچھ غلطیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دو تہائی اکثریت کے زعم میں نواز شریف حکومت مختلف اداروں کے سربراہوں سے محاذ آرائی پر اتر آئی۔ میڈیا کے ساتھ ان کی پرانی مخاصمت تھی جسے اس دور میں بھی برقرار رکھا گیا۔ سپریم کورٹ پر حملہ اس دور کی سب سے بڑی منفی علامت تھی۔ بعدازاں جنرل مشرف کو فوج کی سربراہی سے ہٹا کر جنرل ضیاء الدین کو نیا آرمی چیف بنایا گیا۔ مگر یہی عمل دراصل ان کے گلے کا پھندہ بن گیا۔ نواز شریف بطورِ وزیر اعظم پرویز مشرف کی برطرفی اور نئے آرمی چیف کی تقرری کا قانونی جواز رکھتے تھے مگر فوج اور سربراہ فوج اس کو برداشت نہ کر سکے۔[۵۱]

نائن الیون کے بعد کے حالات کا جائزہ

یوں ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو فوج نے جنرل پرویز مشرف کے حکم پر نواز شریف حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ نواز شریف سمیت کئی سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور یوں ملک ایک بار پھر فوج کے زیر تسلط چلا گیا۔

اردو ناول کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مشرف کی اس آمریت کی عکاسی بھی اردو ناول میں کی گئی ہے۔ طاہرہ اقبال جہاں مشرف کی آمریت کی عکاسی کرتی ہیں وہاں وہ اس حقیقت کو بھی آشکار کرتی ہیں کہ بار بار ملکی سیاست میں فوجی مداخلت میں فوج سے زیادہ قصور ہمارے ان سیاست دانوں کا ہے جو اقتدار کے سنگھاسن

پر براجمان ہونے کے بعد اپنی ذمہ داریوں اور عوامی فلاح کو پس پشت ڈال کر محض اپنے مفادات کا حصول ممکن بنانے میں لگ جاتے ہیں۔ جب وہ ایسے طرز عمل میں پڑتے ہیں تو حالات پر ان کی گرفت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے جس سے فوج کو اک جواز مل جاتا ہے۔ وہ سیاست دانوں کا نااہل اور ملک کے لیے مضر قرار دیتے ہوئے ملکی سیاست کو اپنے کنٹرول میں کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو فوجی حکمرانوں کے ملکی سیاست اور اقتدار پر قابض ہونے پر عوام میں مثبت رد عمل ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عوام سیاست دانوں کو ووٹ دینے کے باوجود ان سے خوش نہیں ہوتے اور اپنے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھ کر ان سے نجات کے خواب دیکھتے ہیں، جوں ہی کوئی فوجی سربراہ آگے بڑھتے ہوئے حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو عوام کو انھی خوابوں کی تعبیر نظر آنے لگتی ہے۔ طاہرہ اقبال عوام کے اس مزاج اور ملکی سیاست کے اس رخ کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> یہ سویلین حکمران تو ملک وتباہی کے اس دھانے پر لا کھڑا کرتے ہیں کہ ڈنڈا مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ ڈنڈا خوشی سے نہیں آتا۔۔۔ مجبوراً آتا ہے۔۔ اسی لیے تو عوام مٹھائیاں بانٹتی ہے۔ پھولوں کے ہار پہنا کر زندہ باد کے نعرے لگا کر استقبال کرتی ہے۔ جشن نجات مناتی ہے۔ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں پر پھول برساتی ہے بوٹوں کی ڈغ ڈغ موسیقی پر جھومتی ہے۔[۵۲]

طاہرہ اقبال نے مشرف کی آمریت کا تذکرہ کرتے ہوئے اس ناول میں سویلین حکمرانوں کے کھوکھلے پن کو بھی خوب نمایاں کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ سویلین حکمران جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوتے ہیں، عوامی نمائندے کہلاتے ہیں لیکن اقتدار میں آنے کے بعد یہ بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے عوامی نمائندگی کا بھی کوئی حق ادا کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان پر مصیبت آتی ہے تو یہ عوام سے یہ توقع بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ان کے لیے باہر نکلیں یا اپنا رد عمل دیں۔ اس کی وجہ ان سویلین حکمرانوں اور سیاست دانوں کی اخلاقی گراوٹ اور عوام کے ان پر اعتماد کا فقدان ہے۔ یہ جب حکومت میں ہوتے ہیں تو بڑے بڑے کریڈٹ لیتے ہیں لیکن حکومت سے محروم ہوتے ہی ان کی جو حالت ہوتی ہے طاہرہ اقبال اسے یوں نمایاں کرتی ہیں:

> چھ رویہ سڑکوں کے منصوبہ ساز، چاغی کے پہاڑوں کا دل دہلانے کا کریڈٹ لینے والے، معاشی پالیسیوں میں ترقی یافتہ ممالک کی ہم رکابی کے دعوے دار بھاری

بھوٹوں کے راستے میں حقیر چونٹیوں کی طرح چڑمڑ۔ جب بے پر چونٹیاں خود ہی
بوٹوں کی زد میں آنے کی احمقانہ جرات کریں تو پھر بوٹوں کا قصور۔[۵۳]

پرویز مشرف نے حکومت سنبھالنے کے احتساب اور اصلاحات کا نعرہ بلند کیا۔ جہاں تک اصلاحات کا تعلق ہے مشرف دور میں بہت سے ایسے کام بھی ہوئے جو بلاشبہ ملکی ترقی اور عوامی فلاح کے اہم ترین کاموں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس دور کا اہم تاریخی واقعہ نائن الیون کا واقعہ ہے جب امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر دو جہاز ٹکرائے اور دیکھتے دیکھتے وہ فلک بوس عمارت جو امریکی معیشت کا سرتاج بھی تھی زمین بوس ہوگئی۔ اس واقعے کا تجزیہ کیا جائے تو ایک وہ فوری رد عمل تھا جو اس واقعے کے بعد دیکھنے میں آیا جسے مجاہدین نے اپنی فتح قرار دیا اور امریکی رعونت کو ملیامیٹ کرنے کے دعوے بھی کیے گئے۔ طاہرہ اقبال نیلی بار کے ایک مذہبی کردار کی زبان سے اس رد عمل کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"ہم نے امریکہ کو تباہ کر دیا۔"
"آسمانوں سے گزدو گز ہی چھوٹے ہوں گے وہ تھے جنھیں ہم نے۔۔ ہم نے چت گرادیا۔ ہم نے یعنی ہم مسلمانوں نے امریکہ پر چڑھائی کر دی۔ انھی کے جہازوں کو انھی پر دے مارا۔ کنڈ (پشت) لگادی پوری دنیا کے وڈے چودھری کی ہم نے۔[۵۴]

امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی نے ایک طرف امریکہ کی معیشت کو نقصان پہنچایا تو دوسری اس کے کچھ عرصہ بعد ہی سامنے آنے والے اقدامات نے اس حقیقت کو آشکار کیا کہ اس تباہی نے امریکہ کے ساتھ ساتھ مسلمان قوم کو بھی بہت نقصان سے دوچار کیا۔ اگرچہ اس تباہی کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ نہیں تھا لیکن اس کو بہانا بناتے ہوئے امریکہ نے جس طرح افغانستان کو آتش و آہن کی بارش میں نہلا دیا اس کے اثرات دنیا بھر خاص طور پر پاکستان پر بھی گہری طرح پڑے۔ دہشت گردی کے نام پر شروع کی جانے والی اس جنگ میں پاکستان نے بہت قربانیاں دیں۔ نتیجے میں پاکستان کو خود دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑا پاکستان کے شہروں میں بھی بم دھماکے اور خودکش حملے ایسے ہوئے کہ امن وامان کے مسائل بڑھتے ہیں چلے گئے۔

طاہرہ اقبال کے ناول نیلی بار میں قیام پاکستان سے لے کر مشرف کے عہد تک کی عصری تاریخ کا بڑی جامعیت سے احاطہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے بڑی مہارت سے پاکستان کی اس عصری تاریخ کو ناول کے روپ میں پیش کر کے ادب اور تاریخ کے رشتے کو مزید مضبوط بنایا ہے۔

اردو ناول میں پاکستان کی عصری تاریخ کے واقعات کے عکاسی دیگر کئی ناول نگاروں نے بھی کی ہے، لیکن طاہرہ اقبال کی انفرادیت اس حوالے سے سامنے آتی ہے کہ ایک تو انھوں نے زیادہ تر حقیقی کردار اور تاریخی شخصیات کے اصلی ناموں کے تاریخ کے واقعات کو ادب میں سمویا ہے۔ دوسری طرف انھوں نے ان عصری واقعات کے پاکستانی سماج پر پڑنے والے اثرات کو بھی نمایاں کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں کہانی تاریخی ارتقا کے ساتھ آگے بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔ تاریخ کو بیان کرتے ہوئے وہ غیر جانبدارانہ انداز میں آگے بڑھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر اور دیگر کئی تاریخی سیاسی شخصیات کے سیاسی اتار چڑھاؤ کی کہانی بیان کرتے ہوئے وہ جہاں ان کے اچھے کارناموں اور عوام میں ان کی مقبولیت کو سامنے لاتی ہیں وہاں ان سے سرزد ہونے والے غلطیوں اور لغزشوں کے ساتھ ساتھ عوام میں ان کے خلاف پائی جانے والی نفرت کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔ یہ غیر جانبدارانہ انداز ان کے فکشن کو تاریخی حوالے سے اہم بناتا ہے۔ مجموعی طور پر طاہرہ اقبال کے ناولوں خاص طور پر ان کے ناول نیلی بار میں پاکستان کی عصری تاریخ کی عکاسی بڑے جان دار انداز میں ہوئی۔ عصری تاریخ کے حوالے سے ان کے ناول اردو کے نمائندہ ناولوں میں شمار ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ دیویندر سرا، "ادب اور تہذیب کا بحران" مشمولہ: گفتگو، جلد ۱، شمارہ ۲ (۱۹۶۷ء)، ص ۲۸۵۔

۲۔ طاہرہ اقبال، گراں (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۲۲۔

۳۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۳۹۔

۴۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۴۱۔

۵۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۲۷۔

۶۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۷۹۔

۷۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۸۵۔

۸۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۹۰۔

۹۔ اعجاز فاروقی، پاکستان کا فکری بحران (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۹۔

۱۰۔ شاہد نواز، پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ (سرگودھا: جامعہ سرگودھا، ۲۰۱۸ء)، ص ۶۱۔

۱۱۔ ظفر اقبال، نیلی بار۔۔طاہرہ اقبال کا نیا ناول (کالم) مطبوعہ، روزنامہ دنیا، (لاہور: ۲۷ اپریل ۲۰۱۷ء)۔

۱۲۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۷۲۔

۱۳۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۷۷۔

۱۴۔ شاہد نواز، پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ، ص ۶۹۔

۱۵۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۷۶۔

۱۶۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۷۷۔

۱۷۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۸۰۔

۱۸۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۸۱۔

۱۹۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۸۵۔

۲۰۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۸۷۔
۲۱۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۹۷۔
۲۲۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۹۸۔
۲۳۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۹۸۔
۲۴۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۹۹۔
۲۵۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۰۱۔
۲۶۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۰۵۔
۲۷۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۷۱۔
۲۸۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۵۳۔
۲۹۔ حقی حق، کوڑھ کی کاشت، طبع ششم (لاہور: شفیق پبلی کیشنز، جولائی ۲۰۰۰ء)، ص ۹۳۔
۳۰۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۶۱۔
۳۱۔ صفدر حسین، پاکستان کی تعمیر نو: فلسفہ او رلائحہ عمل (لاہور: نگارشات، ۱۹۹۲ء)، ص ۳۷۔
۳۲۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۷۵۔
۳۳۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۷۷۔
۳۴۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۷۶۔
۳۵۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۷۸۔
۳۶۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۲۶۲۔
۳۷۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۷۷۔
۳۸۔ ریاض احمد شیخ، پاکستان۔ جمہوریت او رفوجی مداخلتیں (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۲۵۔
۳۹۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۸۱۔
۴۰۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۲۵۵۔
۴۱۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۲۶۱۔
۴۲۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۲۶۴۔

۴۳۔ شاہد نواز، پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ، ص۸۶۔

۴۴۔ احمد سلیم، ٹوٹی بنتی اسمبلیاں (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۰ء)، ص۳۴۲۔

۴۵۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص۳۳۸۔

۴۶۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص۳۳۸۔

۴۷۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص۳۸۱۔

۴۸۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص۳۴۴۔

۴۹۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص۳۴۴۔

۵۰۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص۳۴۶۔

۵۱۔ شاہد نواز، پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ، ص۹۰۔

۵۲۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص۳۷۷۔

۵۳۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص۳۷۸۔

۵۴۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص۳۹۵۔

باب سوم

ناول نیلی بار اور گراں میں سماجی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

باب سوم:

ناول نیلی بار اور گراں میں سماجی عناصر کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

الف۔ خطہ پنجاب کی ثقافت کا جائزہ

ثقافت کا مادہ ث ق ف (ثقف) ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے دانائی، زیرکی یا کسی کام کے کرنے میں صداقت اور مہارت کا ہونا۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے ساتھ عام طور پر " تہذیب " کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر الفظ کے مادے پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ لفظ بھی مہارت اور صداقت کے قریب قریب معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تہذیب کا مادہ ھَذَ ب ہے جس کا لغوی مطلب درخت تراشنا، کاٹنا اور اصلاح کرنا کے ہیں۔[1] مصباح اللغات میں اس کا مطلب پاکیزہ کرنا اور درست کرنا بھی لکھا ہے۔[2] یوں دیکھا جائے تو ثقافت اور تہذیب ایک دوسرے کے قریب قریب مفہوم کے حامل الفاظ ہیں۔ جہاں ثقافت کا مفہوم انسان کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں پر محیط نظر آتا ہے وہیں تہذیب انسان کے اطوار و عادات کی شائستگی اور پاکیزگی کو ظاہر کرتی ہے اور یہ دونوں مل کر ایک ایسے انسان کو سامنے لاتے ہیں جو آدابِ معاشرت کے ساتھ ساتھ علوم و فنون میں بھی خاص مہارت رکھنے والا ہو۔ ثقافت انسان کو دوسرے انسانوں کے قریب کرنے اور ایک دوسرے سے سیکھنے کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو سماج سے ہم آہنگ ہونے میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔

انسان سماج سے کٹ کر نہ تو خود کسی قابل رہ سکتا ہے اور نہ ہی وہ زندگی کے ارتقائی مراحل احسن طریقے سے طے کر سکتا ہے اسے زندگی گزارنے کے لیے ہر لمحے سماج سے تعلق رکھنا ضروری ہوتا ہے بصورت دیگر وہ ایک ایسی اکائی بنا رہے گا جسے دوسروں کے ساتھ مل کر اجتماعیت سے ہمکنار ہونا نصیب نہ ہوگا اور بہت جلد وہ اپنا وجود کھو دے گا۔ یوں جب انسان سماج کے باقی عناصر سے تعلقات بڑھاتا ہے تو پھر انسان اور سماج لازم ملزوم بنتے چلے جاتے ہیں، انسان سماج سے اور سماج انسان سے فوائد حاصل کرنے لگتا ہے، سماج کے باقی عناصر کے ساتھ ملکر ایک باہمی مشترکہ ثقافت وجود میں آتی چلی جاتی ہے جو انسان کو معاشرے اور اس میں پروان چڑھنے والی اس ثقافت کا ایک اہم عنصر بنا دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یو کہا جا سکتا ہے کہ ثقافت کی تشکیل کسی ماورائی دنیا میں نہیں ہوتی بلکہ کسی بھی سماج کے مختلف افراد اور دیگر عناصر مل کر اس کی تشکیل کرتے ہیں۔ یوں تہذیب اور ثقافت ارتقائی مراحل طے کرتی چلی جاتی ہیں۔ تہذیب اور ثقافت دونوں

ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی ان دونوں کو ملا کر کلچر کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور کلچر کا لفظ استعمال کرنے کا جواز یوں پیش کرتے ہیں۔

> میں نے لفظ ثقافت اور تہذیب کے معانی یکجا کر کے ان کے لیے ایک لفظ کلچر استعمال کیا ہے جس میں تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفاہیم شامل ہیں۔اس کے معنی یہ ہوئے کہ کلچر ایک ایسا لفظ ہے جو زندگی کی ساری سرگرمیوں کو خواہ وہ ذہنی ہوں یا مساوی خارجی ہوں یا داخلی احاطہ کر لیتا ہے۔[3]

ثقافت، تہذیب اور کلچر کے مفہوم میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت وسعت بھی پیدا ہوتی گئی۔ 18 ویں صدی تک آتے آتے مغربی مصنفین اسے زیادہ وسیع اور معین معنوں میں استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے ہاں اب کلچر سے مراد دل و دماغ اور ذوقِ نظر کی تہذیب تھی۔وہ تعلیم کے توسط سے ذہنی نشوونما، ترقی اور بہتری کے ساتھ ساتھ عادات و خصائل کی نفاست کے حصول کو بھی تہذیب کے دائرہ کار میں شامل کرنے لگتے ہیں۔

> The cultivating or development of the mind(Faculties and mannars) improvement or refirement by education..the intallectual side of civilization [4]

اس بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کلچر میں انسان کی مادی و ذہنی اور علمی ترقی کا وسیع تر مفہوم پایا جاتا ہے یوں کلچر کا مفہوم ثقافت کے مفہوم کے قریب تر ہے کیوں کہ یہ انداز و اطوار میں شائستگی، سلیقہ اور زیرکی و دانائی کا ہی مرہون منت ہوتا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مفاہیم اور مطالب میں وسعت اور تبدیلی پیدا ہوتی رہی ہے لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ ان میں تہذیب و تربیت اور اکتساب و تحصیل کا تعلق فرد کے اعمال سے ہی ہے۔

ثقافت کے مفہوم کو واضح کرنے اور اسے وسعت بخشنے میں اہم کردار اے۔بی ٹیلر کا بھی ہے۔ اے۔بی ٹیلر نے اپنی کتاب *Primitive culture* میں ثقافت کے مفہوم پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اے۔بی ٹیلر کے خیال میں "ثقافت، علوم و فنون، عقائد و رسوم، اخلاقیات، قوانین، عادات و اطوار سے مملو وہ اسلوبِ حیات ہے جس کا اکتساب انسان معاشرے کے فرد کی حیثیت سے کرتا ہے۔"[5]

ٹیلر کے اس بیان میں ایک بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ٹیلر نے ثقافت کے مفہوم کو فرد کی داخلی تہذیب کے محدود معنوں سے نکال کر ایک قوم یا طبقے کی وسیع تر مجلسی زندگی پر پھیلا دیا ہے۔ ٹیلر نے عادات و اطوار اور رسوم کے سیکھنے کے عمل کو انسان کا انفرادی نہیں بلکہ معاشرتی عمل قرار دیا ہے یوں ان عادات و اطوار کے نتیجے میں سامنے آنے والے رویے جو ثقافتی رویے ہوں گے وہ بھی انفرادیت کی بجائے اجتماعیت اور فرد کی بجائے معاشرے کی ترجمانی کرنے اور معاشرے کی پہچان بن کر ابھرنے والے ہوں گے۔ ٹیلر کے مفہوم سے ملتے جلتے خیالات ہمیں کلائیڈ کلخوٹن (Clyde Kluckhotan) کے ہاں بھی ملتے ہیں۔اس کے خیال میں" یہ وہ نظامِ حیات ہے جو ایک گروپ کے لوگوں میں نظامِ اقدار کی شکل میں مشترک طور پر موجود ہوتا ہے۔"[۱]

ثقافت کو لوگوں کے مشترکہ انداز واطوار اور روئیوں کا نام دینے کے حوالے سے فلپ بیگ بائی (Philip Bag By) کی رائے بھی خاصا وزن رکھتی ہے۔ فلپ بیگ بائی کے خیال میں:

> ثقافت کسی اجتماع کے بیشتر افراد کے ان متواتر روئیوں کا نام ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے نسلی اور جبلی نہیں ہوتے بلکہ کسی اجتماع نے خاص ماحول میں مخصوص عقائد وافکار اور دوسرے اثرات کے تحت اپنے اندر پیدا کر لیے ہوتے ہیں۔اور ان میں یک رنگی پائی جاتی ہے۔[۲]

فلپ بیگ بائی کی اس رائے سے دو اہم باتوں کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ثقافت معاشرے کے اجتماعی روئیوں کا نام ہے ان روئیوں کی تشکیل میں فرد کی بجائے پورا معاشرہ شامل ہوتا ہے۔ فرد کی حیثیت اس میں گروہ کی ایک ایسی اکائی کی ہوتی ہے جو اپنا وجود منوانے کے لیے معاشرے یا گروہ کا محتاج ہوتا ہے دوسری بات یہ کہ ثقافت معاشرے کے انداز واطوار سے ہی جنم لیتی ہے۔ یہ کسی کو وراثت میں نہیں ملتی اسی وجہ سے یہ نسلی یا جبلی نہیں ہو سکتی۔ معاشرے کے مختلف افراد کے رویئے اور انداز واطوار جب اس طرح ایک دوسرے سے مل کر سامنے آتے ہیں کہ ان میں انفرادیت کی بجائے ایک یک رنگی سامنے آتی ہے تو ثقافت تشکیل پاتی ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ثقافت افراد معاشرہ کے اجتماعی انداز واطوار اور روئیوں سے تشکیل پاتی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تشکیل کے پیچھے فرد کی ذات ہی کارفرما ہوتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے فرد ہی ثقافت کی اکائی ہوتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ایس ایم یوسف اپنے مضمون *Some aspect of Islamic Culture* میں لکھتے ہیں:

> ثقافت اساسی طور پر ایک ذہنی رویہ ہے نفس و آفاق کے بارے میں یہ انسان کی اپنی ایک سوچ کا نام ہے۔ خوشیوں اور دکھوں کے بارے میں ایک مخصوص تصور کی شکل ہے یہ اس کی اپنی خوش بختی یا بد بختی کے بارے میں رد عمل ہے اور روزمرہ کے پیش آنے والے واقعات کے درمیان ایک سلیقہ مندی سے گزر کرنے کا کام ہے۔ رویوں کی یہ ساری انسانی جہتیں بعض بنیادی اقدار کے شعور سے پھوٹتی ہیں۔[۵]

ان تمام تعریفوں کے جائزے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ثقافت دراصل انسانی رویہ اور انداز و اطوار کا نام ہے اور اس کی تشکیل کا عمل فرد کی سلیقہ مندی اور شعور سے شروع ہوتا ہے اور معاشرے کے اجتماعی انداز و اطوار میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ یوں تشکیل پانے والی ثقافت میں اس معاشرے کے اجتماعی رویوں کی عکاسی ہوتی ہے اور یہی اجتماعی رویئے اس معاشرے کی پہچان بن کر سامنے آتے ہیں۔ کوئی بھی رویہ یا طرز عمل جب تک ایک فرد کی ذات تک محدود رہے گا تب تک وہ ثقافت یا کلچر کے ذمرے میں داخل نہیں ہو پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک معاشرے کے مختلف افراد کے مختلف انفرادی رویے اور طرز عمل ثقافت نہیں بن پاتے بلکہ جس رویے یا انداز کو معاشرے کے افراد مشترکہ طور پر اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ وہ رویہ یا انداز کسی ایک فرد کی پہچان یا شناخت بننے کی بجائے معاشرے کی مجموعی شناخت بن کر ابھرتا ہے تو وہی رویہ ثقافتی رویہ کہلائے گا۔ اس کی تشکیل میں مذہب اور دیگر بہت سے عناصر بھی کارفرما ہوتے ہیں۔ مذہب، معیشت اور عقائد و افکار معاشرے کے بنیادی اداروں کی حیثیت سے معیارات کی تشکیل کرتے ہیں اور یہ رویئے اور طرز عمل کسی بھی ثقافت کی اصل قوت ہوتے ہیں۔ انھی رویوں سے معاشرے کی مختلف رسوم جنم لیتی ہیں جو کسی معاشرے کی ثقافتی شناخت بن جاتی ہیں۔ شادی بیاہ کی رسوم، آرسی مصحف، مہندی، چوتھی ولیمہ وغیرہ ایک معاشرے کے مخصوص ثقافتی اوصاف بن کر اس معاشرے کی پہچان بن جاتے ہیں۔

اردو ناول کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناول نگاروں نے ثقافتی مظاہر کو بھی بڑی مہارت سے ناول کا موضوع بنایا ہے۔ جس ناول میں جس خطے کی کہانی بیان کی گئی ہے، اس خطے کے سماج اور مذہب کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت بھی سامنے لانے کی کوشش ملتی ہے۔ اردو میں بہت سے ایسے ناول بھی لکھے گئے ہیں جن میں پنجاب کی ثقافت کو بھرپور انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ایسے ناول نگار جن کا تعلق پنجاب کی دھرتی سے ان کے ناولوں میں پنجابی ثقافت کے رنگ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھی ناولوں نگاروں میں طاہرہ اقبال کا نام بھی نمایاں ہے۔ طاہرہ اقبال نے اپنے ناولوں گراں اور نیلی بار میں پنجاب کے ان

خطوں کی ثقافتی اور تہذیبی اقدار کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔

پنجابی ثقافت رنگا رنگ گلدستے کی مانند ہے۔ اس دھرتی کے ثقافتی رنگوں میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ ملبوسات ہوں یا تہوار، خوشی ہو یا غمی ہر جگہ پنجاب کے ثقافتی رنگ نکھرتے نظر آتے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے ان رنگوں کو کشید کرنے میں بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ پنجابی ملبوسات جو کہ پنجابی ثقافت کا اہم عنصر ہیں، طاہرہ اقبال نے ان کی عکاسی ناولوں میں اس طرح کی ہے کہ پنجابی ثقافت جھلکنے لگتی ہے۔ وہ ناول گراں میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

> فاطمہ نے میلے کپڑوں کی پنڈ سفید دوسوتی چادر میں باندھی، جس کے کناروں پر چپہ چپہ کروشیے کی جھالر لٹکتی تھی اور پوری چادر میں دس پھول کڑھے تھے۔ سبز پتیوں اور گلابی پنکھڑیوں والے گلاب کے پھول۔[9]

پنجابی ثقافت کے رنگ دیہات میں زیادہ کھل کر سامنے آتے ہیں۔ خاص طور وہ گھرانے جو مالی حوالے سے زیادہ آسودہ نہیں ہیں ان کے ہاں اس جدید عہد میں بھی پنجابی ثقافت کے قدیم رنگ نکھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ گھروں میں عورتیں نہ صرف گھر کے کام کاج نپٹاتی ہیں بلکہ مردوں کے ساتھ مختلف کاموں میں ہاتھ بھی بٹاتی ہیں۔ اس کے علاوہ گھروں کے بنانے سنوارنے میں بھی جوش و خروش سے حصہ لیتی ہیں۔ طاہرہ اقبال اس ثقافتی رنگ کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> عورتیں پشمینے کی چادریں لپیٹے جانوروں کے کوٹھے صاف کرتیں۔ گھروں میں بھر آیا بارش کا پانی جھاڑو جھاڑو مار باہر نکالتیں۔ ہاتھوں پیروں کی پوریں لال نیلی ٹھٹھر کر گل جاتیں۔ باجرہ، مکئی کوٹتیں، چکیاں پیستیں، کانگڑیاں اور انگیٹھیاں دہنکاتیں، سوں سوں ناک سڑنکتیں، اذانوں کے وقت چائے کے دیگچے چڑھاتیں۔ پراٹھے پکاتیں۔[10]

پنجابی ثقافت کے رنگ اس وقت زیادہ نکھر کر سامنے آتے ہیں جب فصلوں کی کٹائی کا موسم ہوتا ہے۔ خاص طور پر گندم کی کٹائی کے وقت ثقافتی رنگ دیکھنے کی چیز ہوتے ہیں۔ روایتی بھائی چارے کے ساتھ ساتھ ثقافتی رنگ بکھیرتا گندم کی گاہی کا عمل اس دور کی یاد دلاتا ہے جب تھریشر کی بجائے بیلوں سے گاہی کی جاتی تھی۔ اس عمل میں علاقے بھر کے کسان ایک دوسرے کی مدد کو آگے بڑھتے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ سارا علاقہ ایک ہی کنبہ ہے اور ساری فصلیں سانجھی ہیں۔ طاہرہ اقبال نے اس ثقافتی مظہر کی عکاسی ناول گراں میں یوں کی ہے:

ان دنوں گندم کی گاہی ہو رہی تھی۔ سجے ہوئے جیوٹ اور پنجالیوں والے بیلوں کی جوڑیاں اکٹھی ہوئی تھیں۔ موہڑے۔۔۔ گوڑھے، تھلے، بگے، پرتھے، کرپال، پھڈے بیسوؤں گراؤں سے بہترین بیل آئے تھے اور ڈھول اور گھنگروؤں کی آواز پر پڑ (کھلیان) گھاہ رہے تھے۔ بزرگ سروں پر مشہدی لنگیاں اور قراقلی ٹوپیاں جمائے پھلاہیوں دھریکوں کی چھاؤں میں بیٹھے بیلوں اور نوجوانوں کو ہلاشیری دیتے تھے۔[11]

طاہرہ اقبال کا ناول گگراں پنجابی ثقافت کے حوالے سے رشتے ناتوں کی رسومات اور ان سے وابستہ جذبات کی بھی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ پنجابی سماج میں کسی کا رشتہ طے ہونے کے بعد انگوٹھی پہنانے کی رسم کی جاتی ہے۔ یہ انگوٹھی اس امر کی نشانی ہوتی ہے کہ جس کے نام کی انگوٹھی لڑکی نے پہنی ہے، اب ساری زندگی اسی کی ہو کر رہنا ہے۔ گاؤں کی لڑکیوں کو یہ انگوٹھی کس قدر پیاری ہوتی ہے اور اس ایک انگوٹھی کے ساتھ ان کے کتنے جذبات اور احساسات وابستہ ہوتے ہیں، طاہرہ اقبال اس کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

پھر انگلیوں میں پڑی منگنی کی چھاپ (انگوٹھی) کو چوے (چشمے) کے پانی سے مل مل کے دھوتیں۔ جس لڑکی کی انگلی میں یہ چھاپ نہیں بھی تھی وہ بھی دل میں ایک چھاپ بسائے ہوئے تھی۔ سب جانتی تھیں کہ پھپھیرے، ممیرے، مسیرے بھائیوں میں سے جن کا جوڑ بنتا تھا انھی کے نام کی چھاپ سارے وجود میں گڑھی تھی۔[12]

لطیف جذبات صرف انگوٹھیوں تک ہی محدود نہیں ہوتیں بلکہ شادی سے قبل ہی یہ لڑکیاں اپنے ہونے والے شوہروں کو دل میں بسائے ان کی خاطر مدارت اور ان کی خواہشات کے احترام کا سامان کرتی نظر آتی ہیں۔ اس احترام کے جذبے سے بھی پنجابی ثقافتی رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔ طاہرہ اقبال ان لطیف جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

رات کو لڑکیاں لالٹین اور لیمپ کی روشنی میں اپنے منگیتروں، چچیرے، پھپھیرے، ممیرے، مسیرے بھائیوں کے نام کے سویٹر بنتیں۔ جتنے مشکل نمونے ڈالتیں شاید محبت بھی اتنی گوڑھی ہوتی۔ ادھر پنڈی سے گوجر خان، چکوال، اٹک تک سے کالے پھڈے والے سکول کی استانیاں نئے نئے نمونے لاتیں، جو ہاتھوں ہاتھ ساری دنیا سے الگ تھلگ اونچی پہاڑی پر ٹنگے اس گگراں تک بھی پہنچ جاتے۔[13]

طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار بھی پنجابی کی ثقافتی اور تہذیبی اقدار کی عکاسی کے حوالے سے اہم

ناول ہے۔ انھوں نے اس ناول میں پنجاب کی ثقافت، تہذیب، لوگوں کے ثقافتی رویے، خاص طور پر نیلی بار کے علاقے کے لوگوں کی زندگیوں میں تہذیبی و ثقافتی عناصر کا عمل دخل، ان سب چیزوں کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ ایک بڑا ناول نگار نہ صرف اپنے ناول کی کہانی کو آگے بڑھاتا ہے بلکہ وہ خطہ اور وہ کردار جو اس کے ناول کی کہانی میں چل رہے ہوتے ہیں ان کی تہذیب و ثقافت سے بھی آشنائی دلاتا ہے۔ اس حوالے سے طاہرہ اقبال ایک کامیاب ناول نگار کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ ان کی اپنے سماج اور سماج کے لوگوں کی زندگیوں کے مشاغل پر گہری نظر ہے۔ وہ معاشرے کی گہرائی میں اتر کر اس کی تہذیب و ثقافت سے متعلقہ عناصر کو تلاش کرتی ہیں اور سامنے لاتی ہیں۔ تہذیب و ثقافت کی عکاسی کے حوالے سے ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ اگر ناول نگار خود اسی سماج کا حصہ ہو جس کی کہانی ناول میں بیان کی جا رہی ہے تو اس نے ان ثقافتی مظاہر کا بذات خود تجربہ کیا ہوتا ہے۔ وہ ان کا حصہ بن چکا ہوتا ہے، یوں وہ احساسات اور جذبات اور جو ان ثقافتی مظاہر سے پیدا ہوتے ہیں، ناول نگار ان کی بھی بہترین عکاسی کر سکتا ہے۔ طاہرہ اقبال کے ہاں بھی یہی روش ملتی ہے۔ انھوں نے جس سماج کی ثقافتی اقدار کو ناول کا حصہ بنایا ہے، وہ خود اس سماج کا حصہ ہیں، انھوں نے ان تمام ثقافتی مظاہر کا خود تجربہ کیا ہے جو اس خطے کے لوگوں کا طرہ امتیاز ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نیلی بار سے باہر باقی پنجاب کی ثقافت کا بھی وہ براہ راست یا بالواسطہ حصہ ہونے کی وجہ سے پنجابی ثقافت کے جملہ امور سے گہری واقفیت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نیلی بار میں ہمیں پنجابی ثقافت جگہ جگہ جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ لوگوں کا لباس، رسم و رواج، میلے ٹھیلے، مذہبی تہوار، گیت، کھانے اور دیگر ثقافتی عناصر اس ناول میں بھی واضح انداز میں سامنے آتے ہیں۔

پنجابی ثقافت کا اہم عنصر شادی بیاہ کی رسومات ہیں۔ شادی بیاہ کے وقت ثقافتی عناصر بھرپور انداز میں اپنا اظہار کرتے ہیں۔ ایک عرصہ تک پنجاب کے خطے میں ہندو، سکھ اور دیگر اقوام کے بسنے کی وجہ سے اس خطے میں شادی کی اسلامی روایات کے ساتھ ساتھ ان دیگر اقوام کی رسومات بھی رائج ہو گئیں۔ یوں شادی بیاہ کے موقع پر ایک ایسا ثقافتی منظر نامہ سامنے آتا ہے جو پنجابی اقوام کا مشترکہ ثقافتی ورثہ ہے۔ طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں شادی کی تقریبات میں اسی مشترکہ ثقافتی ورثے کی اقدار کی عکاسی کی ہے۔ ناول نیلی بار کے آغاز میں ہی ہمیں شادی بیاہ کے حوالے سے ایسی ثقافتی اقدار ملتی ہیں جن میں گیتوں، سٹھنیوں کا تبادلہ، شادی کے موقع پر پہننے کے لیے خاص طور پر بنائے جانے والے ملبوسات، ڈھول، شہنائیاں وغیرہ شامل ہیں جو ہماری ثقافتی روایت کا حصہ ہیں۔ طاہرہ اقبال نیلی بار کے آغاز میں پنجابی ثقافت کے اس منظر نامے کو سامنے لاتے ہوئے لکھتی ہیں:

لال ہرے نیلے پیلے بوچھنوں اور پراندوں میں لپٹی، مہندی اور کڑوے تیل کی خوشبو میں رچی رنگ برنگ گٹھڑیاں کچی دھول میں اوندھا دی گئیں۔ بھرائیں نے ڈھول کی تھاپ دی، شہنائی کی گونج دار چیخ تیز ہوئی۔۔۔۔ گہرے رنگ لپیٹے لڑکی والیاں سٹھنیوں کے زہر میں بجھے گیتوں کے تیروں سے لیس برات کے استقبال کو بڑھیں۔ باراتیں اس ناگہانی حملے کے لیے تیار تھیں، جوابی سٹھنیوں سے مسلح دفاعی حصار بنا گئیں۔[۱۴]

طاہرہ اقبال ثقافتی مظاہر کی عکاسی کرتے وقت جزئیات نگاری کو خاص طور پر سامنے رکھتی ہیں۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ ثقافتی مظاہر کڑی سے کڑی ملائے سامنے آتے ہیں۔ اگر ناول نگار ان کی عکاسی کرتے وقت کسی کڑی کو حذف کر دیتا ہے تو ثقافتی منظر نامہ کی مکمل عکاسی کرنے سے قاصر رہے گا۔ طاہرہ اقبال نے جہاں برات، سٹھنیوں کے تبادلہ اور گھڑولی بھرنے کی ثقافتی رسومات کی عکاسی کی ہے وہاں اس موقع پر کہے جانے والے مخصوص گیت بھی سامنے لاتی ہیں۔ ان گیتوں میں جوڑا گھوڑا کا گیت، چھینے کا خاص گیت اور رخصتی کے وقت کے گیت اس خطے کی ثقافتی اقدار کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان گیتوں کی وجہ سے ناول کی کہانی میں اصلیت پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کی دلچسپی بھی بڑھ جاتی ہے۔ ایسے ہی گیتوں کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

"میرے پیر دیئے نی جتی ایئے
گل کر مطلب دی بکواس نہ کر کتیے"[۱۵]

پنجابی ثقافت میں شادی بیاہ کے موقع پر کہے جانے والے ایسے گیت اور بولیاں اگر بظاہر کچھ گری ہوئی اور دوسروں کی تضحیک کا عنصر رکھنے والی بھی ہوں پھر اس ثقافتی منظر نامے میں وہ خوشی اور سرمستی کا باعث ہی بنتی ہیں۔ طاہرہ اقبال نے ان ثقافتی اقدار کی عکاسی اسی ثقافتی منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے کی ہے۔

طاہرہ اقبال کے ہاں شادی کی جملہ ثقافتی رسومات کی عکاسی بڑے جاندار انداز میں ملتی ہے۔ ایک عورت ہونے کے ناتے وہ خود ان تمام تجربات سے گزری ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں اصلیت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ وہ کسی بھی ثقافتی مظہر کی عکاسی کرتے ہوئے ان احساسات وجذبات کو بھی کسی حد تک قاری کے سامنے لانے میں کامیاب رہتی ہیں جو ایسے مظاہر کا تجربہ کرتے وقت پیدا ہوتے ہیں۔ شادی کے موقع پر گھڑولی بھری جانا پنجابی ثقافت کا اہم جزو ہے۔ اگرچہ اب شہروں میں اس میں تغیر آچکا ہے تاہم گاؤں کی سطح پر پنجاب میں آج بھی یہ رسم کی جاتی ہے۔ گھڑولی بھری جانے کے عمل سے پنجابی ثقافت اور تہذیب کا ایسا مظہر سامنے آتا ہے جو اس خطہ کی خاص پہچان ہے اور شادی بیاہ کے موقع کے اہم عناصر میں شامل ہے۔ طاہرہ اقبال

شادی کے موقع پر گھڑولی بھری جانے کے عمل کی عکاسی یوں کرتی ہیں کہ اس کا ثقافتی پہلو بھی سامنے آجاتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> اب دلہن کی گھڑولی بھری جارہی تھی، رنگلی جھجھری کے منہ پر لال چنری میں گڑاو رچاول باندھ کر دھرے تھے۔ گھڑولی کے گلے میں ہرے اور عنابی رنگ پھندنوں والے گانے لٹکے تھے۔ چند قدم کوئی ایک سر پر رکھ کر چلتی تو دوسری باری لینے کو اتاؤلی ہو جاتی۔ ڈھول کی تھاپ پر پورے گاؤں میں کنویں اور نلکے ڈھونڈتی پھریں۔ سات سہاگنوں نے سات پانیوں سے ست رنگے روغن والی گھڑولی کو بھرنا تھا۔[16]

ملبوسات اور زیورات کسی بھی سماج کی ثقافت اور تہذیب کے اہم عناصر ہوتے ہیں۔ اور جب کوئی ثقافتی موقع ہو تو اس موقع کے لیے بطورِ خاص تیار کروائے گئے ملبوسات اور زیورات میں اس خطے کی ثقافت جھلکتی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی ثقافتی مظاہر کے لیے تیار کرائے گئے ملبوسات اور زیورات میں ذاتی پسند کے ساتھ ساتھ اس اہم ثقافتی مظہر کے لوازمات کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے شادی کے موقع پر تیار کروائے جانے والے ملبوسات اور زیورات خاص طور پر دلہن کے لباس اور زیورات کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ ثقافتی رنگ نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک جھلک ملاحظہ ہو:

> تیکھی گھوڑی والی ناک میں لال ہرا موتی پروئی نتھ، دوسرے نتھنے میں بیری کے بور کی گھڑت والا لونگ اور ناک کی درمیانی ہڈی میں گھنگریوں والا سونے کا بلاک، جو ہر سانس کے ساتھ کھن کھن دھڑک جاتا تھا۔[17]

اس طرح جزئیات کے ساتھ عکاسی کرنے میں طاہرہ اقبال کا صنفی امتیاز بھی خاص کردار ادا کرتا ہے۔ ایک عورت ہونے کے ناتے وہ ان چیزوں کی اہمیت کو سمجھتی ہیں اور یہ شعور انھیں اس طرح گہرائی میں اتر کر جزئیات نگاری کی طرف مائل کرتا ہے۔

ثقافتی اور تہذیبی حوالے سے انسان جہاں رہتا ہے، وہاں کا اس کا گھر اور گھر سے متعلقہ دیگر چیزیں بھی اہم عنصر شمار ہوتی ہیں۔ گھروں کی تعمیر، آرائش اور دیگر لوازمات تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے اہم ہیں۔ پنجاب کی ثقافت کا جائزہ لیں تو اس خطے میں گھروں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ آرائش میں بھی پنجابی ثقافت کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ گھر بنانے اور سنوارتے وقت لوگ لاشعوری طور پر اس ثقافت کی پیروی کرتے چلے جاتے ہیں جس کا وہ حصہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف خطوں گھر بنانے اور سنوارنے کی ثقافتی اقدار میں کسی حد تک

تغیر بھی ملتا ہے۔اس حوالے سے نیلی بار کے خطے کا جائزہ لیا جائے تو اس خطے میں بسنے والی مہاجر اقوام کی عورتیں اس فن میں طاق نظر آتی ہیں۔ مہاجر عورتیں گھروں کی آرائش کا باقاعدہ اہتمام کرتی ہیں اور یہ کام وہ مستقل مزاجی کے ساتھ کرتی چلی جاتی ہے۔ کچی مٹی سے ماہرانہ انداز میں نقش و نگار اور بیل بوٹے بنا کر گھروں کو خوب صورت بنانے کا یہ عمل ان کی ثقافت اور تہذیب کی پہچان بن کر سامنے آتا ہے۔ طاہرہ اقبال اس کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"چولہوں کے کنگرے کناروں، تیکھی گھڑتوں سے سجاتی مہاجر نیں جن کی انگلیوں میں قدرت نے کیسی فن کاریاں سمودی تھیں جو مٹی سے خوبصورتیاں تراش لیتی تھیں۔ نفیس گھڑتوں والے اوٹے کاڑھنیاں چولہے ، انگیٹھیاں، پرچھتیاں ،بھڑولے ، چکی کے من، تنور، صدوق اس ایک مٹی سے کیا کیا زیبائش وآرائش اور ہنر کاریاں کہ آنکھ دم بخود رہ جائے۔[18]

ثقافتی مظاہر کو تشکیل دینے میں کسی بھی خطے کے جغرافیائی اور موسمی حالات کا بھی خاصا عمل دخل ہے۔ ثقافتی مظاہر موسمی حالات سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔انھی موسمی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے افرادِ معاشرہ اپنے مشاغل اور اپنی سماجی ، تہذیبی اور ثقافتی اقدار تشکیل دیتے ہیں جو اس خطے کا ثقافتی اور تہذیبی سرمایہ قرار پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ثقافتی تہوار خاص موسموں سے مناسبت رکھتے ہیں۔ نیلی بار کے خطے کا تذکرہ کرتے ہوئے طاہرہ اقبال نے یہاں کے گرم موسم اور اس سے متعلقہ ثقافتی و تہذیبی امور کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ اس ناول کا حصہ بنایا ہے۔ یہ ایسا موسم ہوتا ہے جس میں کسانوں کے گھروں میں گندم کی فراوانی ہوتی ہے جو ان کے معاشی صورت حال اور مسرت میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ گندم کے آتے ہی اس کو محفوظ کرنے اور پھر ایک نئی دھن کے ساتھ روٹی پکانے اور محفوظ کرنے کی چیزیں تیار کرنے ، گھروں کو سجانے سنوارنے اور خوشی کے اظہار کے انداز سامنے آنے لگتے ہیں۔ طاہرہ اقبال ان کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

تب لڑکیاں کھجور کے پتے کچے لال ہریالے رنگوں میں رنگ کر چنگیریں اور چھکو بناتی ہیں۔ سوت کے گوڑھے اور تو مبی ہوئی روئی کی پونیاں محفوظ رکھنے کو ڈھکن والی پٹاریاں، گندم کے شوخ رنگ ناڑ سے بنتی ہیں۔ سگریٹ کے پنوں سے سجاوٹی پھول بنا کچی دیواروں پر نیل ملا پوچا پھیر کر سجاتی ہیں ۔ گوبر بھوسہ ملا چکنی مٹی گوندھ گوندھ کوٹھے لیپتی اور صحن میں پکی تلن دیتی ہیں۔[19]

یہاں ظاہر ہو رہا کہ یہ تمام ثقافتی اور تہذیبی امور گندم کے گرم موسم سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے امور کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ اس خطے کے ثقافتی رنگ نکھرتے چلے گئے ہیں۔

ثقافتی اور تہذیبی اقدار کے حوالے سے کسی بھی سماج میں نام اور نام رکھنے کا عمل خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ گھریلو سطح پر ہونے والی نوک جھونک بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف گھروں میں روا رکھی جانے والی بعض پابندیاں بھی تہذیبی منظر نامے کی عکاسی کرتی ہیں۔ پنجاب کی ثقافت کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ اصل نام کی بجائے کسی دوسرے عرف سے پکارا جانا عام روش ہے۔ ناول نیلی بار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طاہرہ اقبال کی اس تہذیبی پہلو پر بھی خاص نظر ہے۔ انھوں نے جن مہاجر عورتوں یا دیگر پنجابی عورتوں کا ذکر کیا ہے، ان کے اصل نام کی بجائے سماج میں پکارے جانے والے ان کے عرف مثلاً فاطی، جٹی، گجری، نگو آرائین، جیا کمہاری وغیرہ کو زیادہ استعمال کیا ہے۔ طاہرہ اقبال ان ناموں سے پکارے جانے والی لڑکیوں کو بھی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے بندھن میں بندھا دکھاتی ہیں کہ ان کی ساری زندگی ایک ہی ڈگر پر گزرتی چلی جاتی ہے۔ طاہرہ اقبال ان لڑکیوں کی جوانی کے مشاغل بھی بڑی بے باکی سے پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنجاب کی اصل تہذیب اور ثقافت میں رچی بسی یہ لڑکیاں جوانی کی عمر بہت کم رکھتی ہیں۔ زندگی کا ابتدائی حصہ بچپن کے کھیل کود جس میں کھیل کود کم اور سینا پرونا، کھانا پکانا سیکھنا زیادہ ہوتا ہے، میں گزر جاتی ہے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے کسی سے تعلقات استوار ہونے کی نوبت ہی آتی ہے تو بیاہ دی جاتی ہیں جس کے بعد بچوں کی کثرت اور سسرال والوں کی خاطر مدارت کرنا ہی ان کی زندگی کا نصب العین اور ان کی بنیادی ذمہ داری ٹھہرتی ہے۔ سسرال میں بھی طرح طرح کی پابندیاں اور خاص طور پر ساس بہو کا روایتی تعلق بھی سامنے آتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس تہذیبی و ثقافتی تناظر کو بھی نیلی بار میں نمایاں کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> یہ ابھی بھی ساسوں کے طعنوں کے تکلوں میں پروئی جاتی ہیں۔ مشقت کی چلم میں سلفے کی لات کی دکھا کر جل بجھتی ہیں۔ یہ ابھی بھی آٹے کی ڈرمی کو، گڑ کے کنستر کو ساس کی پیشگی اجازت کے بغیر چھو نہیں سکتیں۔ یہ شوہر کی فالتو توانائیوں کے نکاس کی بدروئیں تو ہیں لیکن ان کی کمائیوں کی کسی چھینٹ کی مستحق نہیں ہیں۔[۲۰]

طاہرہ اقبال نے رشتوں ناتوں کی صورت حال کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ کسی ایک خاص گھر یا فرد کی بجائے مجموعی سماج کا تہذیبی بن کر سامنے آتے ہیں۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ پنجابی گھرانوں میں نئی بہوؤں کو ایسی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور جہاں تک ساس کے طعنوں کا تعلق ہے تو وہ اب خاص طور

پر پنجاب میں تو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ طاہرہ اقبال نے سماج کے اس تہذیبی و ثقافتی تناظر کو بڑی وضاحت اور اصلیت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے خود اس خطے اور خطے کی ان تہذیبی اقدار کا تجربہ کیا ہے اور اس میں زندگی کو بیتا ہے۔ یہ تجربہ ان کے تخیل کے ذریعے تخلیقی عمل کا حصہ بن کر اصلیت کو ظاہر کرتا چلا جاتا ہے۔

ثقافتی حوالے سے کھانا اور کھانے کے لوازمات بھی کسی خطے کے ثقافتی منظر نامے کے عکاس ہوتے ہیں۔ کھانے میں عام زندگی کے معمولات سے لے کر خوشی، غمی کے موقع پر پکائے جانے والے مخصوص کھانے اور کھانا پیش کرنے اور کھانے کے عمل سے بھی تہذیبی و ثقافتی اقدار سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ناول نیلی بار کا مطالعہ کرنے سے قاری اس حقیقت سے آشنا ہوتا ہے کہ طاہرہ اقبال نے اس خطے کے ماکولات و مشروبات کی عکاسی بھی خوب کی ہے۔ جس کی جس کی وجہ سے یہ ناول اس خطے کا تہذیبی و ثقافتی نقشہ بڑی کامیابی سے کھینچتا نظر آتا ہے۔ نیلی بار کے کھانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے طاہرہ اقبال لکھتی ہیں:

> آج بکرا ذبح ہوا تھا، دیسی گھی کی تری والا مرچیلا شوربا نائی نے دیگ میں پکایا تھا۔ باداموں، میووں، کھویوں والی کڑاہی یعنی سوجی کا حلوہ گھر میں تیار ہوا تھا۔ لال ہرے گاڑھے رنگ والے دسترخوان، چھابیاں، تنوری روٹیوں بھرے چھکو، نوکرانیاں، باہر خبردار کھڑے نوکروں کے ہاتھوں میں پہنچا رہی تھیں۔ تام چینی کی پلیٹیں، کانسی اور پیتل کے چترکاری والے گلاس کمنڈل مونگر، سرساہیاں، باہر ڈھو رہی تھیں۔[۲۱]

اس اقتباس پر غور کریں تو ایک ایک عمل سے پنجابی ثقافت جھلکتی نظر آتی ہے۔ کھانا پکانے کے لیے نائی کا دیگ چڑھانا، اور حلوہ گھر میں خود پکایا جانا، پھر اس سے آگے بڑھتے ہوئے کھانے کے برتن جن میں چنگیریں، چھابیاں، چھکو اور پھر کانسی کے چترکاری والے برتین سب کے سب پنجابی تہذیب و ثقافت کے عکاس بن کر سامنے آتے ہیں۔

پنجاب ایک زرعی خطہ ہونے کے ناتے زراعی فصلوں کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ زرعی فصلیں ایک طرف اس خطے کے باشندوں کے روزمرہ امور اور ان کی معاشی حالت میں سدھار لاتی ہیں تو دوسری طرف ثقافتی حوالے سے بھی ان کی اہمیت ہے۔ فصلوں کی بجائی اور کٹائی کے موسم میں خاص تہوار پنجابی ثقافت کا اہم حصہ ہیں۔ ان فصلی تہواروں کے موقع پر پنجابی ثقافت کے رنگ خاصے نمایاں انداز میں نظر آتے ہیں۔ سال بھر کھیتوں میں مصروف رہنے والے کسان اور ان کے گھر والے ان فصلی تہواروں کے موقع

پر یوں ثقافتی رنگ بکھیرتے نظر آتے ہیں جیسے انھوں نے اپنی محنت کا پورا پھل پالیا ہو۔ ان فصلی ثقافتی تہواروں کے موقع پر دیگر علاقوں کے لوگ بھی ان تہواروں سے معاشی فائدہ اور مسرت حاصل کرنے کی خاطر ایسے علاقوں کا رخ کرتے ہیں جہاں یہ تہوار منعقد ہو رہے ہوتے ہیں۔ یوں پنجاب کا ثقافتی منظر نامہ نکھرتا چلا جاتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے ناول نیلی بار میں پنجاب کے ثقافتی منظر نامے کے اس پہلو کو بھی نمایاں کیا ہے۔ ایک ایسے ہی فصلی تہوار کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

> سال میں بس ایک بار اسی کپاسی موسم میں یہاں فصلی دکانیں سجائی جاتی تھیں، پکوڑے، سموسے، آلو کی ٹکیاں عجب خوشبوئیں چھوڑتیں۔ یہ انوکھے ذائقے صرف کپاس کے موسموں میں یہاں مہکاریں مچاتے انت ڈال دیتے ۔۔۔۔ منیاری اور کپڑے والے ڈیرے ڈال دیتے۔ چھینٹ، کیمرک، ٹویرا، کے ٹی، ساٹن، دل پیاس، خوشابی لنگیاں، سفید پگڑیاں، کیسے کیسے خوش رنگ ڈیزائن۔[۲۲]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طاہرہ اقبال کے ناولوں میں پنجابی ثقافت کے رنگ بڑی آب و تاب سے چمکتے دکھائی دیتے ہیں۔ پنجاب کے باسی ہونے کے ناتے انھوں نے اس خطے کی ثقافت کو اپنے ناولوں کا موضوع بناتے ہوئے دھرتی سے وابستگی کا حق بھی ادا کیا ہے اور اردو ناول کے ثقافتی تناظر کو وسعت دینے کا سبب بھی بنی ہیں۔

سماجی و مذہبی اقدار کا جائزہ :

مذہب کسی بھی معاشرے کے بنیادی عناصر میں شامل ہوتا ہے۔ ہر سماج میں بسنے والے باشندے کسی نہ کسی مذہب کے پیروکار ہوتے ہیں۔ ایک سماج میں مختلف مذاہب کے ماننے والے زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں، لیکن ایک مذہب ایسا ہوتا ہے جو اس معاشرے کا غالب مذہب ہوتا ہے۔ اس سماج کے زیادہ تر باشندے اس غالب مذہب کے ماننے والے ہوتے ہیں۔ مذہب کے اثرات لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر بھی گہری طرح مرتب ہوتے ہیں۔ رہن سہن، تقریبات، خوشی اور غمی کے مواقع کے ساتھ ساتھ سماجی سطح پر ہونے والے مختلف عوامل میں مذہب اور مذہبی اقدار کا عمل دخل بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے کسی بھی سماج کی کسی بھی نہج کا مطالعہ کرتے ہوئے اس میں سے مذہب کو خارج نہیں کیا جا سکتا۔

اردو ناول کی روایت کا جائزہ لیا جائے تو کئی ایسے ناول سامنے آتے ہیں جو مذہبی اقدار کے ذریعے سماج کا نقشہ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ بعض ناول تو لکھے ہی کسی نہ کسی مذہبی واقعہ کو بنیاد بنا کر ہیں۔ مذہبی اقدار کو سماجی عناصر میں گہرا عمل دخل ہونے کی وجہ سے سماجی عکاسی کرنے والے ہر ادب میں مذہبی اقدار کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔

اردو ادب اور خاص طور اردو ناول کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ناول نگاروں نے مذہب کے نام پر رواج پا جانے والی خرافات کو خاص طور پر ناول کا موضوع بنایا ہے۔ یہ ایسی خرافات ہیں جو سماج کی گہرائی میں اتر چکی ہوتی ہیں اور سماج کے مختلف باشندوں کے نزدیک عقیدت کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس عقیدت کی وجہ سے ایک طرف وہ سماجی باشندے ان پر پوری طرح کاربند ہوتے ہیں تو دوسری طرف ان کے خلاف کچھ بھی سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ جب صورت حال یہاں تک پہنچ جاتی ہے تو وہ خرافات اور ضعیف الاعتقادی سماجی حوالے سے اہم عنصر اختیار کر جاتی ہے۔ ایک بڑا ناول نگار نہ صرف مذہبی اقدار کو سماجی تناظر میں سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے بلکہ ایسی خرافات اور ضعیف الاعتقادی کو بھی سامنے لاتا ہے جو سماجی اقدار کا درجہ حاصل کر چکی ہوتی ہیں۔

مذہبی اقدار کے حوالے سے طاہرہ اقبال کے ناول نیلی بار کا مطالعہ کیا جائے تو طاہرہ اقبال نے ایک ماہر سماجیات کی طرح مذہب کے متنوع پہلوؤں کو اس ناول کا حصہ بنایا ہے۔ نیلی بار ناول کا اہم نکتہ چوں کہ نیلی بار کے مقامی باشندوں اور تقسیم کے بعد ہجرت کر کے یہاں بسنے والے مہاجرین کی سماجی اقدار کی عکاسی ہے، اس لیے اس ناول میں انھوں نے مقامی باشندوں اور مہاجرین کے ہاں مذہبی حوالے سے پائے جانے والے فرق کو بھی نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے سماج کے ان دونوں بڑے عناصر کی زندگیوں کا گہرائی میں اتر کر مشاہدہ کرنے کے بعد ان حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو مذہب کے زیر اثر ہیں۔ اس ضمن میں اس ناول میں مختلف نوعیت کے امور سامنے آتے ہیں۔ کہیں تو وہ مقامی باشندوں اور مہاجرین کے ہاں مذہبی تعلیمات کی صورت حال کی عکاسی کرتی ہیں تو کہیں سماج میں مذہب کے نام پر رواج پا جانے والی خرافات کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مذہب کے لوگوں کی نجی اور اجتماعی زندگیوں پر اثرات کو بھی سامنے لاتے ہوئے وہ مذہب اور سماج کے تعلق کو بھی تخلیقی انداز میں سامنے لاتی ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیلی بار کے لوگوں کی سماجی حالت اور اس سماج کی تشکیل میں مذہب کو ایک اہم عنصر کا درجہ حاصل ہے۔

نیلی بار میں سماجی تناظر میں مذہبی اقدار کا مطالعہ کیا جائے تو تقسیم کے بعد مقامی باشندوں اور ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کی مذہبی عقائد اور مذہبی تعلیمات سے وابستگی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ مذہب اور سماج کا تعلق اسی صورت میں واضح ہو سکتا ہے جب کسی سماج میں بسنے والے لوگوں کی مذہب سے وابستگی کی نوعیت کا علم ہو۔ اگر سماجی باشندے مذہبی اقدار سے روگردانی اختیار کرتے ہیں تو وہ مذہب خواہ سماج کا غالب مذہب ہی کیوں نہ ہو، اس سماج پر اثر انداز ہونے سے قاصر ہوتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں مقامی باشندوں اور مہاجرین کے مذہب سے لگاؤ اور مذہبی عقائد اور تعلیمات کی ان کی سماجی زندگی پر اثرات کا

جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے آگاہی دلاتی ہیں کہ تقسیم کے بعد نیلی بار خطے کے مقامی لوگ مذہب سے کوسوں دور تھے۔ اگرچہ اسلام کا ان کے سماج کا غالب مذہب تھا لیکن مقامی لوگوں کی صورت حال یہ تھی کہ ان میں سے بیشتر کو کلمہ اور دیگر بنیادی مذہبی عقائد کا بھی کوئی شعور نہ تھا۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر مذہبی تعلیمات کا ان لوگوں کی نجی اور سماجی زندگیوں میں کوئی عمل دخل نہ تھا نہ ہی وہ ان کے بارے میں کوئی واضح شعور رکھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو مذہبی اقدار کی سختی سے پابندی کرنے والے تھے۔ یہ مہاجرین مذہب کے بنیادی عقائد اور مذہبی تعلیمات کے ساتھ ساتھ قرآن مجید سے بھی گہری وابستگی رکھتے تھے۔ جب کہ مقامی باشندوں کے نزدیک قرآن مجید محض سر پر رکھ کر یا اس پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھانے کے لیے تھا۔ مذہبی تعلیمات اور مذہبی عقائد سے اس دوری کی وجہ سے مقامی باشندوں میں توہم پرستی، ضعیف الاعتقادی اور دین سے دوری کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ وہ درگاہوں اور مزاروں پر ماتھا ٹیکنے اور وہاں سے مرادیں پوری ہونے کے متمنی ہوتے تھے۔ دعا کی قبولیت کے لیے بھی وہ کسی نہ کسی کا وسیلہ ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ ضعیف الاعتقادی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ درختوں اور قبروں کا حاجت روا اور وسیلہ کا درجہ دیتے ہوئے ان کے سامنے اپنی حاجات پیش کرتے تھے۔ طاہرہ اقبال ایک کردار پاکیزہ کے خیالات کی عکاسی کرتے ہوئے اس ضمن میں نیلی بار میں لکھتی ہیں:

> پاکیزہ کو لگتا بار کے قدیمی باشندوں کو کسی صوفی یا بادشاہ نے بزور یا پھر کسی لالچ کی بنا پر خدائے واحد کا مطیع بنایا ہو گا کہ ان کی پرانی فطرت بار بار شجر و حجر کی سمت لوٹتی تھی۔[۲۳]

ناول نیلی بار میں طاہرہ اقبال نے سماج کے باشندوں کی اس ذہنی کیفیت کا بھی بخوبی نقشہ کھینچا ہے جو پیروں اور درگاہوں کی عقیدت میں انھیں ذہنی غلامی تک لے جاتی ہے۔ عقیدت کے نام پر یہ غلامی انسان کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیتی ہے۔ وہ پیر اور اس کی درگاہ سے آگے کچھ بھی سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسے اپنے نفع نقصان اور زندگی کے جملہ امور میں کامیابی اور ناکامی دونوں میں پیر کے رضا ہی نظر آتی ہے۔ طاہرہ اقبال نے سماج کے اس پہلو کو بڑی بے باکی سے بیان کیا ہے۔ وہ یہ دکھانے میں کامیاب ٹھہری ہیں کہ پیر کی درگاہ سے تعلق میں لوگ اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے اور پاک ناپاک کی تمیز بھی نہیں رہتی۔ یہ ہمارے سماج کا ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ جہاں عقیدت کا عنصر آجاتا ہے وہاں سے عقل کو خارج قرار دے دیا جاتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہونے لگتی ہیں۔ ایسا ہی نیلی بار کے کرداروں کے سماجی رویوں کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ ان کے نزدیک بھی پیر اور اس کی درگاہ سے آگے کسی کی کوئی

حیثیت نہیں۔ طاہرہ اقبال اس اندھی عقیدت کو یوں واضح کرتی ہیں:

> ری بدبخت، تو کس سے مخاطب ہے، جو آپ اللہ سائیں کا پرچھاواں ہے۔ کملی یہ اللہ سائیں کا نور۔ ان کی خدمت جنت کا دروازہ۔۔۔ ان کا گند چاٹنا دنیا و آخرت کی سرخروئی۔ ان کے پیر کی مٹی میں مٹی ہو جانا باطن کی روشنائی۔ ان کا تھوکا ہمارے کھانے سے افضل۔[۲۴]

نیلی بار میں طاہرہ اقبال نے نہ صرف اس اندھی عقیدت کو بڑی بے باکی سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے بلکہ وہ ان پیر و فقیروں کی درگاہوں پر باقاعدگی سے حاضری دینے والے اور ان سے مرادیں مانگنے والی کی نفسیات کی بھی بخوبی عکاسی کرتی ہیں۔ انھوں نے اس ناول میں کئی جگہوں پر عوام کے اس سماجی رویے اور سماجی منظر کو واضح کیا ہے جس میں پیر کی ذات پر اس قدر اندھا اعتقاد ہوتا ہے کہ اس کے دربار پر جھاڑو دینا بھی اپنے لیے باعث عزت اور باعث سعادت سمجھتے ہیں۔ ان نزدیک دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی درجہ نہیں کہ پیر کی درگاہ کا مجاور اور وہاں خدمت کرنے والا بن جایا جائے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو کہ سماج میں پیری فقیری کا سحر کس حد تک سرایت کر چکا ہے جس سے آگے کسی کو کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی:

> اپنے اونچے لیکھوں پر وڈیائی کر رہی ہے کہ پیر خانے کی خدمت تیرے بخت میں لکھ دی گئی تو پیروں کی نوکر ہوئی اس سے افضل کوئی دوسرا درجہ اس جگ میں نہیں بنا آج تک۔۔۔[۲۵]

پیر کے دربار تک رسائی کو باعث سعادت سمجھنے والے لوگ پیر کی خوشی میں ہی دنیا جہان کی خوشی دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک پیر کی خوشی میں ہی اللہ کی خوشی ہے اس لیے اپنا سب کچھ پیر کی خوشی پر قربان کر دینا ہی سعادت مندی ہے۔ اگرچہ صاحبِ شریعت اور صاحبِ طریقت بزرگ اور ولی کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس کی تعلیمات جو دین حق کی تعلیمات ہوتی ہیں ان کو اپنی زندگی کا نصب العین بناتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا باعث سعادت ہے لیکن نام نہاد پیروں فقیروں کے نام نہاد مذہبی عقائد اور توہمات کی اندھی تقلید کسی طور پر بھی درست نہیں ہے۔ طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں سماج کی پیش کش کرتے ہوئے سماج کے اس پہلو کو بڑی صراحت سے واضح کیا ہے کہ لوگ اس اندھی عقیدت کے بوجھ تلے دبے خود ساختہ عقائد کی پیروی میں اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اپنی بیٹیوں کو پیر کی درگاہ کا چڑھاوا چڑھا دیتے ہیں۔ نہ صرف خوشی سے یہ عمل کرتے ہیں بلکہ خود ساختہ جنت اور دوزخ کے فیصلے بھی اس عمل کی بنیاد پر کرنے لگتے ہیں۔ ان کے نزدیک پیر کی درگاہ پر چڑھائی جانے والی لڑکی کا درجہ جنتی حور سا ہے جس کے

چڑھاوے سے پیر اور اللہ دونوں کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ طاہرہ اقبال سماج کے اس پہلو اور پیروں سے اندھی عقیدت کے رویے کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

> جب ماں باپ چھوڑ جاتے ہیں تو پیروں کو خوش کرنے کی خاطر ہی چھوڑ گئے نا
> درگاہ پر چڑھاوا چڑھا گئے تو جنتی حور بنا کر چھوڑ گئے نا کہ پیر خوش تو اللہ خوش۔۔
> وہ جس حال میں بھی خوش رہیں ہم خوش۔۔۔[۲۶]

طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار سماج میں پیری فقیری اور اس کے زیر اثر سماج کے باشندوں میں ذہنی اور نفسیاتی سطح پر آنے والی تبدیلیوں کو بڑی صراحت سے پیش کرتا ہے۔ انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جن علاقوں میں پیروں سے اندھی عقیدت کا یہ بیج بو دیا گیا ہے وہ نسل در نسل پروان چڑھتا ہوا اب ایسا تناور درخت بن چکا ہے کہ اس کا قلع قمع کرنا آسان نہیں رہا۔ اس رویے کے پیچھے پیر کی نام نہاد کرامات سے زیادہ اس کے مریدین کی وہ عقیدت کارفرما ہے۔ طاہرہ اقبال یہ دکھانے کی کوشش کرتی ہیں کہ مذہب اور عقیدت کے نام پر ہونے والی خرافات اس حد تک بڑھ جاتی ہیں کہ لوگ زندگی تو درکنار موت کے بعد بھی پیر کی خوشنودی ہی کے متمنی ہوتے ہیں۔ ایسے نام نہاد پیروں نے بھی سماجی رخ کو دیکھتے ہوئے اپنے من گھڑت عقائد تشکیل دیے ہوتے ہیں جو لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ یہاں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ دنیا بھر کی حقوق نسواں کی تحریکیں اور ان تحریکوں کے زیر اثر ہونے والی کانفرنسیں بھی اس حوالے سے خاموش ہیں کہ ان نام نہاد درگاہوں پر حقوق نسواں کی کس طرح دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ ناول نیلی بار کی عذراں بھی اسی استحصال کا شکار ہوتی ہے جو پیر کی عقیدت میں روا رکھا جاتا ہے۔ کسی کو اس کی پروا نہیں کہ پیر کی درگاہ پر چڑھاوا چڑھائی جانے والی پر وہاں کیا بیت رہی ہے۔ ان نام نہاد درگاہوں پر انسانیت کس طرح روندی جاتی ہے اور خواتین کا استحصال کس طرح کیا جاتا ہے، تخلیہ میں کیا کچھ ہوتا ہے جو اس اندھی عقیدت کا ہی ثمر ہے، اس کی عکاسی ناول نیلی بار میں ملاحظہ ہو:

> "نی عذراں نی کملی ہوئی ہے۔"
> ان لفظوں سے بوجھل زبانیں دانتوں تلے کٹتی تھیں۔ وہ لہو سے لت پت صرف ایک قمیص میں ننگی رانوں پر بھاگ رہی تھی، جیسے اس کے اندر درد کی تراڑیں چھوڑتی کوئی کوک بھری ہو جو اسے رکنے نہ دیتی ہو۔ رانوں پر لہو کے لوتھڑے جمے ہوئے تھے۔ ننگے پیروں کی ایڑیاں اور پنجے سنے تھے۔ قمیص کا گھیرا ہوا میں کسی جھنڈے کی طرح پھڑ پھڑاتا اور لہو آلود ستر دیکھ کر خادمائیں ایک دوجی کے چپے دیتی تھیں۔[۲۷]

عورت کا عقیدت کے نام پر یہ سماجی استحصال اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اکثر درگاہوں میں ایسا ہونا معمول سمجھا جاتا ہے۔ یہ عقیدت ہی ہے جو اس ظلم کے خلاف کسی کو آواز اٹھانے پر بھی نہیں اکساتی اور اگر کوئی ایسی کوشش کرنے کی جسارت کرے بھی تو اسے اس طرح خاموش کرا دیا جاتا ہے کہ دوسرا کوئی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ طاہر اقبال نے مذہب اور عقیدت کے نام پر رواج پا جانے والی ان سماجی خرافات کو نیلی بار میں واضح انداز میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ سماج میں پیروں کی یہ اندھی عقیدت اس درجہ رائج ہو چکی تھی کہ اگر ایک لڑکی جو پیر کی درگاہ پر چڑھاوا چڑھائی گئی، اس سے ان کی کوئی بے ادبی یا حکم عدولی ہوئی، یا عذرا کی طرح وہ جنسی ہوس کا شکار بن کر سب کے سامنے بھاگ کھڑی ہوئی اور آخر اسی بھاگ دوڑ میں جان سے بھی چلی گئی، تو اس کے ورثا بجائے اس ظلم کے خلاف کوئی آواز بلند کرتے اور ایک معصوم جان کے یوں "پیر کی خوشنودی پر قربان" ہو جانے کے خلاف احتجاج کرتے، وہ ذہنی غلامی اور نفسیاتی بدحالی کی وجہ سے عذرا کی اس حرکت کو اپنے لیے دنیا و آخرت کی ناکامی اور اپنے جہنمی ہونے کا باعث سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کو اس حد تک نفسیاتی سطح پر متاثر کر دیا گیا کہ عذرا کی یوں خون میں لت پت بھاگنے اور پھر جان سے جانے کے عمل کو پیر کی بے ادبی قرار دیا گیا۔ وہ اس ظلم پر احتجاج کرنے کی بجائے اس کی تلافی کے لیے عذرا کی چھوٹی بہن کو بھی اسی درگاہ پر چڑھاوا چڑھانے کے لیے لے آتے ہیں اور اس کی ذہنی اور نفسیاتی کایا کلپ اس طور کر دی جاتی ہے کہ وہ معصوم لڑکی اپنی بہن کے "گناہ" اور بے ادبی کو مٹانے اور ماں باپ کو جہنم سے بچانے کے لیے خود اس درگاہ کے جہنم کا ایندھن بننے کو تیار ہو جاتی ہے۔ عذرا کے والدین جب اپنی چھوٹی بیٹی کو چڑھاوے کے لیے لاتے ہیں تو ان کا انداز تکلم دیکھیے:

> ہم راندہ درگاہ ہوئے۔ ہم دھتکارے گئے۔ ہائے اس جھلی نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ ہم جہنمی ہوئے ہم دوزخ کا بالن ہوئے۔ معافی کا در بند ہوا۔ درگاہ معاف نہ کرے تو اللہ سائیں کیوں کر معاف کرے ہائے کبھی نہ کرے کبھی نہ بخشے جائیں ہم دونوں۔۔۔ سائیں ہمارے پاس بس یہ آخری چڑھاوا ہے یہ بھی دھتکاری گئی تو ہم کس چوکھٹ کے پائے کو تھامیں گے جیتے جی مر جائیں گے۔[۲۸]

والدین کی یہ آہ وزاری اس معصوم کے نازک دل و دماغ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور اسے بھی ساری کامیابی اور ناکامی اس درگاہ اور اس سے وابستہ ہستیوں کی خوشنودی سے مشروط نظر آنے لگتی ہے۔ وہ بھی اس عقیدت میں ریجھتے ہوئے کہتی ہے:

> میں اپنی بہن کے گناہِ کبیرہ کی تلافی کے لیے لائی گئی ہوں اور ہر ریاضت اور ہر چلے

سے گزر جانے کا حوصلہ لے کر آئی ہوں کہ کہیں دھتکاری نہ جاؤں میرے
والدین جہنمی نہ ہو جائیں۔[۲۹]

یہ چلے اور ریاضتیں جنسی ہوس اور عزت و عصمت کی لوٹ مار پر منتج ہوتے تھے۔ اس کے باجود سماج میں ان نام نہاد پیروں کے معاملے میں ان کی خوشی سے آگے سوچنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔

طاہرہ اقبال نیلی بار کے ذریعے مذہب کے نام پر ہونے والے اس استحصال کو کئی زاویوں سے نمایاں کرتی ہیں۔ ایک طرف اس نام نہاد عقیدت اور پیر کی خوشنودی کی خاطر بیٹیوں کی عزتیں قربان کی جاتی ہیں تو دوسری طرف مال و متاع بھی ان درگاہوں کی نذر ہوتا چلا جاتا ہے جن کی بنیاد محض دھوکا دہی اور انسانیت کو فریب دینے پر قائم ہوتی ہے۔ انھوں نے سماج میں اس پیری فقیری کے اثرات کو اس حد تک نمایاں کیا ہے کہ لوگوں کے نزدیک دنیا میں آنے کا اگر کوئی مقصد ہے تو وہ ان نام نہاد پیروں کی خوشنودی کا حصول ہے۔ یہ خوشنودی دل و دماغ کو اس حد تک مفلوج کر دیتی ہے کہ پیر کی درگاہ پر کسی کو بے ادبی کی جرات تو درکنار ایسا سوچنا بھی دنیا و آخرت کے خسارے کا باعث لگنے لگتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے نہ صرف ان درگاہوں کے اندرون خانہ ہونے والی خرافات کو نمایاں کیا ہے بلکہ سماج میں ان درگاہوں کے ساتھ اندھی عقیدت کو بھی کئی زاویوں سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس حقیقت کو سامنے لاتی ہیں کہ مال و متاع اور عزت اور عصمت کو قربان کرنے والوں کے نزدیک پیر کا دیدار ہی دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضمانت ہے اس کے لیے وہ کسی حد تک بھی جانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ طاہرہ اقبال ایسی ہی اندھی عقیدت اور سماجی رویوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتی ہیں:

> زیارت کا وقت شروع ہو چکا تھا، مریدین کی لمبی قطاریں بندھی تھیں۔ سروں پر رومال باندھے، سینوں پر دونوں ہاتھ جوڑے نگاہیں جھکی قدم قدم حدِ ادب میں بڑھتے ہوئے کہیں سوئے ادب نہ ہو جائے۔ خبردار یہ بارگاہِ ادب واحترام ہے۔ بے ادبی کا شائبہ بھی عمرِ رواں اور آنے والی نسلوں کو برباد کر دے گا۔ صبح سے دوپہر ڈھل آئی تھی۔ لائین تھی کہ اتنی لمبی کہ دس نکلتے تو بیس مزید کھڑے ہو جاتے۔ نذرانوں کی تھیلیاں جیبوں میں ٹھنسی ہوئیں، بھینسوں اور بیٹیوں کے چڑھاوے پہلے ہی خلیفوں کو سونپ چکے تھے لیکن شوقِ دید تھا کہ انتظار کی بے قراری کو شدید تر کر رہا تھا۔[۳۰]

سماج میں ان پیروں فقیروں سے عقیدت ایک اہم سماجی عنصر بن چکا ہے۔ ایسے خطے جہاں پیری فقیری کا زور زیادہ ہے وہاں کے سماج پر اس کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے نیلی بار کے تناظر

میں اس سماجی عنصر اور اس کی فریب کاریوں کو اس ناول میں بڑی صراحت کے ساتھ واضح کیا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت سے روشناس کرایا ہے کہ مذہب کے نام پر روا رکھی جانے والی یہ سماجی خرافات صرف عزت اور مال کے لٹنے اور لٹانے کا ذریعہ ہی ہیں اس سے زیادہ نہ ان کو سماج اور سماجی باشندوں کے مسائل سے کوئی غرض ہے اور نہ مذہب سے کوئی تعلق واسطہ ہے۔ یہ سب کچھ کر گزرنے کا ذریعہ بھی ذہنی اور نفسیاتی دباؤ میں لانا ہی جس کے بعد پیر کی ذات ایک ایسے مینارہ کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس کی طرف ہر ایک کو نظر کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے ایک اہم سماجی ناظر ہونے کے ناتے نہ صرف ان خرافات کی عکاسی کی ہے بلکہ وہ اس کے مستقبل کو بھی سامنے لاتی ہیں۔ ان کے خیال میں یہ خرافات جو سماج میں اندھی عقیدت اور نفسیاتی غلامی کی وجہ سے رواج پا چکی ہیں مستقبل میں بھی ان سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیری فقیری کا یہ سلسلہ سماج سے آگے بڑھتے ہوئے اقتدار کے ایوانوں تک بھی پہنچ چکا ہے۔ ایسی صورت میں لوگوں کو ایماندار اور صالح قیادت کے انتخاب کی بجائے ووٹ ڈالتے وقت بھی پیر کی ذات ہی نظر آتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے بہت سے خطے خاص طور پر جنوبی پنجاب میں یہ سلسلہ کافی مضبوط ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ذہنی اور نفسیاتی غلامی ہے۔ سماج کے باشندے جب اس غلامی سے نکلنے کو خود تیار نہیں ہوتے تو کوئی باہر سے آ کر ان کی اصلاح کیسے کر سکتا ہے۔ طاہرہ اقبال اس سماجی بدحالی اور اس کے مستقبل کا نقشہ کھینچتے ہوئے نیلی بار میں لکھتی ہیں:

> ضعیف الاعتقادی کے مقدس رازوں پر چڑھے عقیدتوں کے غلاف گوٹے کناریوں سے سجائے جاتے رہیں گے۔ چوم کر کھولے جاتے رہیں گے اور آنکھوں سے مس کر کے قبروں پر بچھائے جاتے رہیں گے۔ انسانی فطرتوں کا اصلاح کار آج تک روئے زمین پر کوئی پیدا نہ ہوا ہر فرد اپنے اندر کے انسان کا خود مالک نہیں ہے۔ اس اندر کے انسان کی طبیعت وطینت ظاہری انسان کے اپنے قابو میں نہیں ہے تو کسی خارجی تعزیر و تحدید کے اندر کیسے جا سکتی ہے۔ [۲۱]

طاہرہ اقبال نے سماج کا مذہبی تناظر میں جائزہ لیتے ہوئے ان درگاہوں پر ہونے والی خرافات اور عوام الناس کی اندھی عقیدت کو بڑی بے باکی سے واضح کیا ہے۔ وہ ان درگاہوں کے ظاہر باطن کے تضاد کو بھی سامنے لاتی ہیں کہ اگرچہ ظاہری طور پر ان درگاہوں پر تہجد سے لے کر تمام نمازوں اور ذکر اذکار کا خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے لیکن اندرون خانہ جو خرافات ہوتی ہیں وہ مہذب سماج میں کسی طور پر بھی لائق تحسین نہیں ہیں۔

ناول نیلی بار میں مذہبی حوالے سے طاہرہ اقبال سماج کے ایک اور زاویے کو بھی پیش کرتی ہیں وہ زاویہ مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے حوالے سے ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس ناول میں مدرسے میں تعلیم کا ایک خاص زاویے سے جائزہ لیا ہے۔ وہ سماج کے اس رویے کو سامنے لاتی ہیں کہ مدرسے میں تعلیم کا حصول بھی بعض کے نزدیک دنیاوی جاہ وجلال اور مالی منفعت کا ذریعہ ہے۔ وہ اس کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ملاقات کو آنے والی مائیں خوش تھیں کہ بچوں کو پیٹ بھر کھانے کو مل رہا تھا۔ نورانی داڑھیوں والے مس خام کو خالص سونا بنا رہے تھے، جب مدرسے کی پاک فضاؤں سے نکلیں گے تو رمضان میں نجی محافل اور مساجد میں بیسویں گریڈ کی تنخواہ سے بھی زیادہ پر بک کیے جائیں گے ۔ جن کا گلا سریلا ہے وہ تو اتنا نام او ردھن پائیں گے کہ اتنا تو کسی کلاسیکی گائیک، کسی پوپ سنگر کو بھی اس پاک سرزمین پر کبھی نہ ملا ہوگا۔ ان پر اتنے نوٹ برسائے جائیں گے کہ اتنے تو کبھی کسی ناچتی پر نہ برسے ہوں گے۔ [۳۲]

طاہرہ اقبال نے مذہبی تعلیم کے حوالے سے جس سماجی ناہمواری کی نشاندہی کی ہے وہ بھی کسی نہ کسی طور ہمارے سماج میں دیکھی جاسکتی ہے۔ آج بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مذہبی تہواروں پر خرافات کے ساتھ ساتھ مذہب کے نام پر فضول خرچی اور روپے لٹانے کا رواج اس قدر بڑھ چکا ہے کہ طاہرہ اقبال کی کہی ہوئی بات سچ ثابت ہونے لگتی ہے۔ انھوں نے ایک اور سماجی ناہمواری کو نمایاں کیا ہے کہ بعض شیطان صفت لوگ مذہب کے لبادے میں طلبا کے جنسی استحصال سے بھی باز نہیں آتے اس کے علاوہ سزاؤں کا طریقہ بھی ایسا ہوتا ہے جس کی کسی مہذب معاشرے میں گنجائش نہیں۔ طاہرہ اقبال اس ضمن میں لکھتی ہیں:

> ہر حجرے میں مختلف جماعتیں بیٹھی تھیں۔ ہر استاد کی سزا کا طریقہ خود ساختہ اور انتہائی جدید تھا لیکن مصری استاد کا طریقہ یہاں عام مروج تھا۔ ہر بچے کی رانوں کے بیچ ایک دکھتا ہوا پھوڑا رکھا تھا، جو لہو ٹپکاتا تھا اور ٹیسیں چھوڑتا تھا۔ [۳۳]

مذہبی تناظر میں پاکستانی سماج کا جائزہ لیا جائے تو ایک اہم زاویہ افغان جہاد کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ یہ ایسا دور تھا جب ایک طرف پاکستان پر ایسی حکومت مسلط تھی جو مذہب کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی تو دوسری طرف سوویت یونین کو شکست دینے کی خاطر امریکہ بھی افغان جنگ میں کود پڑا تھا اور مجاہدین تیار کر کے افغانستان بھیجے جا رہے تھے۔ اس عہد کا پاکستان سماج جہاد اور مذہب کا رنگ لیے ہوئے سامنے آتا ہے۔ اس مقصد کے لیے افواج پاکستان اور اس کے زیر اثر چلنے والے عسکری کیمپ بھی نمایاں کردار ادا کر رہے تھے۔

سماج میں جہاد پر جانے کی ترغیب دینے کا رجحان بھی عام پایا جاتا تھا۔ طاہرہ اقبال نے اس مذہبی عنصر کو بھی اس طرح نمایاں کیا ہے کہ اس کے سماجی اثرات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ انھوں نے ان نوجوانوں کو ایسے خام مال کے طور پر پیش کیا ہے جسے عسکری کیمپوں میں جہادی بنایا جاتا تھا اور ان کی ذہن سازی کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت بھی کی جاتی جس سے ان کا ذہن موم اور جسم فولاد بن جاتا۔ طاہرہ اقبال اس کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

"تم عساکرِ اسلام کے ٹرینی ہو۔"

۔۔۔۔۔"نہیں اس مقصد کے لیے عساکر پاکستان کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ ہم تو خام مال عسکری کیمپوں تک پہنچانے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اس خام دھات کے اندر جوش شہادت ابھارتے ہیں، جذبہ جہاد پیدا کرتے ہیں اس حد تک کہ وہ موم کا چھتہ بن جاتے ہیں پھر جیسے چاہیں انھیں موڑ لیں اس موم کو انھی کیمپوں میں فولاد بنایا جاتا ہے۔[۳۴]

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار سماج اور مذہب کے حوالے سے بہت سے زاویوں کو نمایاں کرتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اس ناول میں نہ صرف مذہبی عناصر کی عکاسی کی ہے بلکہ سماجی باشندوں کی مذہب سے وابستگی کی نوعیت کو بھی واضح کیا ہے۔ انھوں نے یہ دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے سماج پر جہاں دیگر بہت سے عناصر نے اپنے اثرات مرتب کیے وہاں مذہب کے نام پر بننے والے اس ملک کو سماجی سطح پر مذہبی عناصر نے خوب متاثر کیا۔ خاص طور پر جنرل ضیاء الحق کا دور جس میں مذہب کو اہم سماجی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اقتدار کو طول دیا گیا، اس دور میں پیری فقیری اور مذہبی عناصر کو کھل کھیلنے کا موقع ملا۔ اس کو مزید تحریک افغان جہاد سے ملی جب وطن کے جوانوں کو مجاہدین بنا کر سوویت یونین کے مقابلے میں کھڑا کیا گیا۔ شہید اور غازی کے نعرے بلند کیے گئے اور سماج کو مکمل طور پر مذہبی رنگ میں رنگ دیا گیا۔ اس دور میں پیروں فقیروں کی گدیوں کو بھی نوازا گیا۔ ان درگاہوں پر ہونے والی خرافات کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کو ایسے مراکز قرار دیا گیا جو سراسر رشد و ہدایت کا ذریعہ ہوں۔ عوام کے اس رجحان کی وجہ سے ان پیروں فقیروں کی بھی چاندی ہوئی اور انھوں نے درگاہوں سے بڑھ کر اقتدار کے ایوانوں تک رسائی حاصل کر لی اور پالیسی سازی اور قانون سازی کے عمل پر اثر انداز ہو کر سماجی سطح پر خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ طاہرہ اقبال نے ان مذہبی عناصر کی خرافات، ان کے ظاہر باطن کے تضادات اور ان کی سماجی حیثیت کے ساتھ ساتھ سماج پر ان کے اثرات کو بڑی بے باکی سے اس ناول میں واضح کیا ہے۔ انھوں نے ایک ماہر سماجیات کا طرح سماج کا مشاہدہ اس کی روح میں اتر کر کیا ہے۔

وہ ظاہر اور باطن دونوں پر نظر رکھتی ہیں اور سماج کے ظاہری رخ کے ساتھ ساتھ اس کے باطن کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ انھوں نے جس بھی سماجی عنصر کی عکاسی کی ہے اس کے ظاہر باطن دونوں رخ سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ان کا سماجی مشاہدہ خاصا معتبر قرار پاتا ہے۔

ج۔ معاشرے اور اس کے ارتقا کا جائزہ

انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ زندگی کے مختلف لوازمات پورے کرنے کے لیے اسے بہت سے دوسری سماجی عناصر سے تعلق قائم کرنا پڑتا ہے۔ اس تعلق کی بنا کر سماج کے رشتے گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سماج کو سمجھنے اور جاننے کے لیے ہمیں اس کا مختلف زاویوں سے تجزیہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سماج کے بارے میں آگاہی حاصل کرنے کے لیے مختلف لغات کی مدد لی جائے تو ویبسٹر انگلش ڈکشنری میں سماج کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے :

> Humain beings in general taken in realation to one antoher: an organized community: a body of person united for some common purpose: the more cultivated or more fashionable part of the community.[۳۵]

سماج کی اس تعریف کو دیکھا جائے تو سماج انسانوں کا وہ گروہ یا اکٹھ قرار پاتا ہے جس کی تشکیل باہمی تعامل اور تعلقات کی بنا پر ہوتی ہے۔ اس تعامل اور تعلق میں کئی عناصر حصہ لیتے ہیں۔ ایک سماج میں مختلف انسانوں کے ہونے کے باوجود سماج کا اپنا غالب منظر نامہ بھی ہوتا ہے۔ اس غالب منظر نامے میں اس سماج کی وہ تمام اکائیاں شامل ہوتی ہیں جن سے اس سماج کی تشکیل ہوئی ہوتی ہے۔ سماج کی تشکیل میں حصہ لینے والے یہ عناصر متنوع خصائص کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے عناصر بھی ہوتے ہیں جو مثبت اقدار اور مثبت طرز عمل کے حامل ہوتے ہیں جب کہ بعض عناصر منفی سرگرمیوں اور منفی اقدار کو رواج دینے والے ہوتے ہیں۔ یوں سماج مثبت اور منفی دونوں طرح کی اقدار سے تشکیل پاتا ہے۔ سماج کی تفہیم کے لیے بھی ان دونوں طرح کے عناصر کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

سماج کی تشکیل میں بنیادی کردار انسان ہی ادا کرتا ہے۔ انسان ہی اس بنیاد کا کام کرتا ہے جس پر سماج کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس لیے سماج میں ہونے والی ہر تبدیلی سے انسان متاثر

ہوتاہے۔انسان کا سماج سے کٹ کر رہنانہ صرف محال بلکہ ناممکن ہوتاہے۔انسان کے اخلاقی اور تہذیبی اوصاف صرف اس کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ سماج کو بھی متاثر کرتے ہیں۔یوں انسان اورسماج ایک دوسرے کے لیے لازم قرا رپاتے ہیں۔نہ تو انسان سماج سے الگ اپنا وجود برقرار رکھ پاتاہے اورنہ ہی سماج کی تشکیل و ترقی انسان کے بغیر ممکن ہے۔

سماج کی تشکیل کا سبب بننے والے انسان مختلف مزاج اورمختلف اطوار کے مالک ہوتے ہیں۔ہر شخص کا ایک خاص مزاج ہوتاہے جو اسے دوسروں سے منفرد کرتاہے۔سماج کی تشکیل میں انسان کے یہ مختلف مزاج اپنی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے بھی یوں ایک دوسرے میں مدغم ہوجاتے ہیں کہ سماج کاایک خاص مزاج بن جاتا ہے۔اس امتزاجی مزاج میںپروان چڑھنے والی اقدار ہی اس سماج کی نمائندہ اقدار قرار دی جاتی ہیں۔ان سماجی اقدار میں مثبت اور منفی دونوں قسم کی اقدار شامل ہوتی ہیں۔

سماجی اقدار کی تشکیل میںانسان کے مزاج کے ساتھ ساتھ اس سماج کی تہذیب،ثقافت اورسیاسی منظرنامہ بھی اہم کردار اداکرتے ہیں۔تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے خاص پس منظر رکھنے والےسماج میں تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا فروغ زیادہ ہوگا۔یہی تہذیبی اورثقافتی اقدار اس سماج کی پہچان بھی بن جاتی ہیں۔سیاسی منظر نامے پر بات کی جائے تو کسی بھی سماج کا سیاست سے گہر اتعلق ہوتاہے۔سیاسی حوالے سے استحکام کے حامل سماج میںسماجی اقدار زیادہ بہتر انداز میں نموپاتی ہیںجب کہ ایک ایسا سماج جوسیاسی حوالے سے انتشارکاشکار ہووہاںسماجی اقدار کی شکست و ریخت ہوتی رہتی ہے۔ایسا سماج جو سیاسی حوالے سے انتشار کا شکار ہواس میں سماجی اقدار کو کھل کر پروان چڑھنے کا موقع نہیں مل پاتا۔یہی وجہ ہے کہ تاریخ عالم کے وہ ادوار جن میںدنیا کے کسی بھی ملک کا سیاسی منظر نامہ انتشارکا شکار رہا۔وہاں سماجی اقدار کو بھی فروغ نہ مل سکا۔اس کی وجوہات پر غور کیا جائے تو جس طرح سماج کی تشکیل میںمختلف عناصر مل کر کام کرتے ہیں۔اسی طرح سماجی اقدار کو پروان چڑھانے میں بھی مختلف عناصر کامشترکہ طرز عمل لازم ہوتاہے۔سیاسی انتشارکے زمانے میںیہ مشترکہ عمل سامنے نہیں آپاتا۔ملکی سیاست میں انتشاراوربدنظمی کے اثرات براہ راست افراد معاشرہ کے طرزعمل پرپڑتے ہیں۔جس کی وجہ سے سماجی اقدار بھی متاثر ہوتی ہیں۔

سماجی اقدار کو پروان چڑھانے میں کسی بھی سماج کی طبقاتی تفریق کا بھی اہم کردار ہوتا ہے۔سماج مختلف انسانوں سے تشکیل پاتاہے۔ان انسانوں کے سماجی مراتب ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں جس کی وجہ سے سماج میں طبقاتی تفریق سامنے آتی ہے۔ہندوستان کے سماج کاجائزہ لیاجائے تو ہندوستانی سماج قدیم دورسے ہی مختلف طبقات میں تقسیم نظر آتاہے۔اس ذات پات کے نظام کی تشکیل میں معاشی حالات اور پیشہ ورانہ ہنرمندی کا اہم کردار رہاہے۔ایسے سماج میں دولت مند اعلیٰ مرتبے کاحامل قرار پاتا ہے جب کہ غریب او رناداروں کی قسمت میں ان اعلیٰ مراتب کے حامل لوگوں کی خدمت کرنا ہی ہوتاہے۔اس طبقاتی تفریق کی وجہ سے سماج میں پروان چڑھنے والی اقدار بھی متنوع انداز کی حامل ہوتی ہیں۔اعلیٰ طبقے کی اپنی سماجی روایات اور سماجی اقدار ہوتی ہیں جب کہ ادنی طبقے کے لوگوں کی اپنی اقدار ہوتی ہیں۔ایسی صورت حال میں یہ اقدار ایک دوسرے سے کافی حد تک مختلف بھی ہوتی ہیں لیکن سماج کا مجموعی مطالعہ کرنے کے لیے ان دونوں طرح کے طبقات کی اقدار کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔کیوں کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی سماج سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ہندوستان کی اس سماجی تفریق کے حوالے تاریخ پر نگاہ دوڑائیں تو ہندوستانی سماج میں رواج پانے والی اس طبقاتی تفریق میں سماجی مرتبے نے اہم کردار ادا کیا۔اس سماجی مرتبے کی بنیا دمذہبی اقدار پر قائم تھی۔مذہبی اقدار اورمعاشی ضروریات نے مل کر ہندوستانی سماج کو طبقات میں تقسیم کردیا۔یہ تفریق اس قدر گہری ثابت ہوئی کہ پورا ہندوستانی سماج طبقات کی بنیاد پر ایک دوسرے سے الگ نظر آنے لگا۔ڈاکٹر انورسدید ہندوستانی سماج میں پید اہونے والی اس طبقاتی تفریق کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ذات پات کی اس تقسیم سے معاشرتی ضرورتوں کو زیادہ اہمیت ملی۔چنانچہ مذہبی فرائض کی انجام دہی برہمنوں کو تفویض ہوئی۔ملک کی حفاظت کشتریوں کے سپرد ہوئی۔عامۃ الناس دیش کہلائے اورکاروباری امور ان کے ذمے لگائے گئے۔سب سے نیچ شودر تھے جن کاکام برتر طبقات کی خدمت انجام دینا تھا۔[۳۶]

سماجی اقدار کی تشکیل میں مذہب اورمذہبی اقدار کوخاص عمل دخل ہوتاہے۔ہندوستان کے حوالے سے دیکھا جائے تو مندرجہ بالا سطور میں بیان کیے گئے حقائق ہندوستان میں ہندومت مذہب کے حوالے سے ہیں جب کہ ہندوستان میں بسنے والی دیگر اقوام جومختلف مذاہب سے تعلق

رکھتی ہیں ان کی اپنی مذہبی روایات اورمذہبی اقدارہیں۔ یہ مذہبی اقدار سماجی اقدار کا بھی درجہ رکھتی ہیں۔کسی بھی سماج سے مذہب کو نکال باہر نہیں کیاجاسکتا،کیونکہ سماجی اقدار بھی کسی نہ کسی عقیدے کا مظہرہوتی ہیں اورمذہب ہی عقائد کی بنیاد ہوتاہے۔سماج میں سے مذہب کو نکال باہر کرنے کامطلب سماجی اقدار کو عقیدے اور قلبی لگن سے دور کرکے محض اعمال تک محدود کردینا ہے۔ایسی صورت میں سماجی اقدار میں استحکام اورپائیداری مفقود ہوتی چلی جاتی ہے۔یہ بات درست ہے کہ انسان کے اعمال سماجی اقدار کو پروان چڑھاتے ہیں لیکن یہ اعمال اگر مذہب کے احکامات کے مطابق ہوں گے اور مذہب کا رنگ ان پر نظر آئے گا تو وہ پورے سماج کے ترجمان بنیں گے اورسماجی اقدار میں ڈھلیں گے ، بصورت دیگر وہ شخصی اعمال ہی رہیں اور سماجی اقدار کا درجہ نہیں پاسکیں گے۔

اردوناول کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتاہے کہ ناول شروع ہی سے سماج کے زیر اثر رہاہے۔ ناول نگاروں اپنے عہد کے سماجی منظرنامے کومختلف زاویوں سے ناول میں اجاگرکیاہے۔ سماجی پیشکش کا یہ انداز ناول میں متنوع حوالے سے ہوا۔ سماجی اقدار کی تشکیل کے مختلف عناصر اور مختلف سماجی اقدار ہمیں اردو ناول میں جھلکتی دکھائی دیتی ہیں۔

جدید عہد میں طاہرہ اقبال کاشمار بھی ایسے ناول نگاروں میں ہوتاہے جن کے ناولوں میں سماج اور سماجی اقدار کی پیش کش ملتی ہے۔ طاہرہ اقبال کا سماجی مشاہدہ خاصا وسیع اور گہراہے۔انھوں نے جس عہد کو اپنے ناولوں میں سمویاہے وہ ان کا آنکھوں دیکھاعہد ہے۔انھوں نے عصری تاریخ کے سماجی تناظر کو ناولوں میں یوں بیان کیاہے کہ قیام پاکستان کے بعد کے پاکستانی سماج کا پورا نقشہ کھینچاہے۔انھوں نے اپنے ناولوں میں سماجی اقدار کو بیان کرتے ہوئے ان اقدار کے مذہبی تناظر کو بھی سامنے رکھاہے۔ اس کے علاوہ مختلف سماجی رویے بھی ان کے ناولوں میں بڑی صراحت سے سامنے آتے ہیں۔ یہاں ہم ان کے ناولوں کا سماجی مطالعہ پیش کرتے ہوئے پنجاب کے سماج، ثقافتی اور مذہبی اقدار کو سامنے رکھیں گے اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ طاہرہ اقبال کے ناول سماجی حوالے سے اردوناول نگاری کی روایت میں کس مقام ومرتبے کے حامل ہیں۔

گراں طاہرہ اقبال کاایک ایساناول ہے جو سماجی پس منظر میں لکھاگیاہے۔ یہ ناول اگرچہ پوٹھوہار کی تہذیب وثقافت کے گرد گھومتاہے یوں اس کا مقامی کینوس محدود ہے تاہم طاہرہ اقبال نے اس ناول میں سماج کے رویوں اور تہذیبی ومذہبی عناصر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس ناول میں انھوں سماجی سطح پر ہونے والے رشتے ناتوں اور دیگر سماجی اقدار کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ پنجاب میں رشتوں ناتوں کا انداز منفرد ہے۔ ایک

طرف بزرگوں کی یہ چاہت ہوتی ہے کہ اپنی برداری میں ہی رشتے طے کیے جائیں اور خاندان کے لڑکے اور لڑکیاں اپنے خاندان میں ہی رہیں ۔دوسری طرف جدید تعلیم کے حصول کے بعد اچھے روزگار اختیار کرنے والے لڑکے اور لڑکیاں اس خاندانی روش سے انحراف کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ اپنے جوڑ کا رشتہ چاہتے ہیں۔ ناول گراں کا اکبر خان بھی ایسا ہی ایک لڑکا ہے جو فوج میں بھرتی ہونے کے بعد خود کو گاؤں والوں سے برتر سمجھتا ہے اور گاؤں میں اپنی ان پڑھ برادری کی کسی لڑکی کی بجائے باہر کی کسی تعلیم یافتہ کو اپنانے کی چاہت رکھتا ہے۔ طاہرہ اقبال گاؤں والوں کے انداز میں اس سماجی عمل کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

> سن صاف کہہ دیا اپنے اکبر خاننے کہاس ان پڑھ پوٹھوارن سے شادی کرنے والا نہیں، وہیں بیاہ دیں کسی گراں میں شہروں کے لائق نہیں ہے۔[۳۸]

طاہرہ اقبال کے ناول گراں میں پنجابی سماج کے نقشے جگہ جگہ ملتے ہیں۔ پنجاب سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انھوں نے پنجاب کے سماج کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کیا ہے۔ خاص طور پر پوٹھوار کا وہ خطہ جس کی کہانی ناول گراں میں بیان کی گئی ہے اس خطے کے طرز بود و باش، لوگوں کے ماکولات و مشروبات اور پہناووں سے پنجابی سماجی اقدار کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس ناول میں پنجابی سماج کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کو حقیقی سماج کی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے۔ پوٹھوار کے لوگوں کے کھانے پینے کے انداز اور خاص طور پر مختلف سالن پکانے سے اس خطے اور خاص طور پر پنجاب کے سماج کی پاکستان کے دیگر خطوں کے سماج سے انفرادیت سامنے آتی ہے۔ طاہرہ اقبال نے پنجابی سماج کی عکاسی کرتے ہوئے ان منفرد چیزوں کو بڑی مہارت سے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔انھوں نے اس ناول کی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے پنجاب کے اس سماج تک پہنچایا ہے جو دیہاتی ماحول سے تعلق رکھتا ہے۔ پنجاب کا دیہاتی سماج کھانے پینے، رہن سہن اور لباس کے حوالے سے شہری سماج سے خاصا مختلف ہے۔انھی کھانے پینے کی اشیاء سے طاہرہ اقبال نے پوٹھوار کے خطے کی سماجی اقدار کی اس ناول میں پیش کیا ہے۔ایک جگہ وہ پوٹھوار کے خطے کی انھی معروف سماجی اقدار کو پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> عام گھرانوں میں ساگ کے کنے چڑھتے جس میں لسی ملا کر کھٹا سالن پکایا جاتا لیکن جب کوئی سرکاری اہلکار یا مہمان آتا تو پھر دیسی مرغا بھون کر پکتا اور شوربے والا بٹیر یا تیتروں کا سالن الگ بنتا۔ گندم کے آٹے کے پھلکے اور باداموں کھوپرے والا سوجی کا حلوہ بنتا۔ پوٹھوار کی یہ عورتیں مرغ پلاؤ پکانا بھی خوب جانتی تھیں۔[۳۹]

طاہرہ اقبال نے یہاں جس طرح سماجی منظر نامے کو واضح کیا ہے وہ خاص پنجابی اور بالخصوص پوٹھواری سماج ہے۔ اس سماج کی یہ اقدار آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

طاہرہ اقبال کے ناول گراں کا سماجی تناظر میں جائزہ لینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے قبل از تقسیم سماج کا نقشہ بھی بڑی مہارت سے کھینچا ہے۔ تقسیم سے قبل اس خطے میں مسلمان، سکھ اور ہندو مشترکہ طور پر رہتے تھے۔ اگرچہ مذہبی افتراکات نمایاں تھے تاہم سماجی سطح پر ان مختلف مذاہب کے بسنے والوں سے ایک ایسا مشترکہ سماج قائم تھا جو اپنی خاص روایات اور اقدار رکھتا تھا۔ اس سماج میں باہمی اشتراکات اور ایک دوسرے سے ہمدردی کا جذبہ بھی نمایاں تھا۔ سماجی اقدار کا جائزہ لیا جائے تو تقسیم سے قبل کے پنجابی سماج میں وضع داری، رکھ رکھاؤ، دوسروں سے محبت اور اخوت، ایک دوسرے کا خیال رکھنا اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا وہ مشترکہ اقدار تھیں جنھوں نے اس سماج کے مختلف عناصر کو آپس میں جوڑ کر رکھا ہوا تھا۔ طاہرہ اقبال کا ناول گراں ہمیں تقسیم سے قبل کے اس سماج کی اقدار سے بھی آگاہی دلاتا ہے۔ وہ اس سماج کی صورت حال بیان کرتے ہوئے ناول گراں میں لکھتی ہیں:

> اناج کی تھوڑ تو نہیں اور جہاں کمی نظر آتی تو ایک ایک بٹھل ہر گھر سے اٹھا کر وہاں چھوڑ آتے۔ یہاں بال بچے، دھی دھانیاں، مال ڈنگر فصل کھیت کھلیان، خوشی غمی سب سانجھے تھے۔ زمینوں مکانوں کی ملکیت آباؤاجداد کے نام پر تھی جنھیں مرے ہوئے بھی آدھی پونّ صدی گزر چکی۔ کبھی ملکیت یا تقسیم کا قضیہ اٹھا ہی نا تھا کہ بٹوارہ ہوتا۔[40]

سماجی حوالے سے دیکھا جائے تو طاہرہ اقبال نے نہ صرف عام زندگی اور خوشی کے مواقع کی سماجی اقدار کی عکاسی کی ہے بلکہ غمی اور موت کی سماجی اقدار کو بھی اس ناول میں نمایاں کیا ہے۔ موت کے وقت یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا علاقہ ایک خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس دکھ میں سب برابر کے شریک ہیں۔ طاہرہ اقبال اس کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> پوٹھوار کے میت بھی پہاڑی علاقوں کے جفاکش افراد کی طرح ہی پر مشقت اور طویل ہوتے ہیں۔ پورے چالیس دیہاڑے پھوڑی پڑی رہی۔ ہر روز ادھر ساگری روات، پنڈی، گوجر خان، ادھر جہلم، چکوال، اٹک تک سے مقانیں (تعزیتیں) آتیں اور تین تین گھنٹے جم کر ماتم کیا جاتا۔ منہ سے چادریں ہٹا کر ابھی سوجی ہوئی آنکھیں پونچھتیں کہ پھر کوئی مقان آن پہنچتی۔ رانیں اور سینے پیٹ پیٹ چھد گئے۔[41]

سماجی اقدار اور سماجی ارتقا کے حوالے سے طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار بھی خاص اہمیت کا حامل ناول ہے۔ طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار تاریخی حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی حوالے سے بھی خاص اہمیت کا حامل ناول ہے۔ اس ناول کا کینوس خاصا وسیع ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر اکیسویں صدی کے ابتدائی عشرے تک کی سیاسی اور عصری تاریخ کے ساتھ ساتھ سماجی عکاسی بھی اس ناول کا طرہ امتیاز ہے۔ طاہرہ اقبال نے بڑی مہارت سے اس ناول میں پاکستان اور خاص طور پر پنجاب کی تہذیب، ثقافت اور سماجی اقدار کو موضوع بنایا ہے جو اس ناول کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس ناول کے آغاز میں ہی نیلی بار کے علاقے کی سماجی صورت حال واضح کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح اس خطے میں باہر سے آنے والے لوگوں نے سماجی تفریق پیدا کی۔ قدیم دراوڑ اور کول نسل کے وہ باشندے جو اس خطے کے مقامی لوگ تھے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی سماجی حیثیت تبدیل ہوتی چلی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چکوال، سیالکوٹ اور پنڈی سے اٹھ کر بہت سے ایسے نئے آباد کار اس خطے میں آ بسے تھے جو سخت جان ہونے کے ساتھ ساتھ خود کو سماج میں برتر بھی خیال کرتے تھے۔ یہ لوگ ایسی اقوام سے تعلق رکھتے تھے جو پنجاب میں سماجی حوالے سے اعلیٰ طبقہ گنا جاتا ہے۔ ان اقوام میں اعوان، راجے، ملک، گکھڑ اور دیگر ایسی اقوام کے لوگ شامل تھے جو خود کو چودھری اور دوسروں کو کمین سمجھتے تھے۔ ان لوگوں نے نیلی بار کے علاقے کے مقامی لوگوں کو کمین کا درجہ دیتے ہوئے ایسی سماجی صورت حال پیدا کر دی کہ وہ لوگ جو مقامی تھے وہ سماجی حوالے سے اس قدر پیچھ ہو گئے کہ ان کی اپنی پہچان ہی ختم ہو گئی۔ اب ان لوگوں کی اگر کوئی پہچان تھی تو وہ ان کے مالکوں اور زمینداروں کے نام سے تھی۔ طاہرہ اقبال ان لوگوں کی سماجی حیثیت کو یوں سامنے لاتی ہیں گویا ان کی پیدائش کا مقصد ہی اپنے مالکوں اور اونچے طبقے کے لوگوں کی خدمت کرنا تھا۔ طاہرہ اقبال اس سماجی طبقے کے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> مالکوں کی غلاظتیں دھونے اور بدلے میں لاتیں ٹھڈے کھانے، دہکتی ہوئی بھٹی سی دھرتی کی دراڑوں سے بچے کھچے بھورے چننے اور حیاتی بھر گوھا، پوسی، بھوسا، مٹی ولورنے والوں کو کیا خبر کہ اس خطے میں کیسی جغرافیائی اور سیاسی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اور اب وہ ایک نئے اسلامی ملک کے باشندے کہلانے لگے ہیں۔[۴۲]

طاہرہ اقبال کا یہ قول اس حقیقت سے آشنائی دلاتا ہے کہ اگرچہ قیام پاکستان کے بعد بہت سی سیاسی و سماجی تبدیلیاں واقع ہوئیں لیکن اس کے باوجود نیلی بار کے سماج کا یہ نچلا طبقہ اسی طرح غلامی کی زندگی بسر

کرتا رہا جیسا تقسیم سے قبل تھا۔ یہاں طاہرہ اقبال تقسیم کے بعد اس خطے میں نئے آباد کاروں کی آمد نے بھی اس خطے کی سماجی حیثیت میں کچھ تغیر پیدا کیا۔ تقسیم کے بعد اس خطے میں جو نئے آباد کار آئے ان میں سے زیادہ تر بھی سماج کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان لوگوں کے آنے سے سماجی میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں ان میں سماجی شناخت کا بحران اہم عنصر بن کر ابھرا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہجرت کر کے آنے والوں میں گوجر، آرائیں اور جٹ اقوام سے تعلق رکھنے والے ایسے لوگ شامل تھے جو سماجی اور خاندانی مراتب کی وجہ سے خود کو برتر اور مقامی لوگوں کو خود سے کمزور اور حقیر سمجھتے تھے۔ گویا ان کی آمد سے مقامی لوگوں کی شناخت بدلنے کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ دوسری طرف مقامی لوگ ان نئے آنے والے کو مہاجر، پناہ گیر اور پناہی جیسے القاب عطا کر کے ان کی سماجی شناخت پر سوالیہ نشان لگا رہے تھے۔ شناخت کا یہ بحران ہجرت کے بعد ایک اہم سماجی عنصر کے طور پر پروان چڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

طاہرہ اقبال نے ہجرت کے عمل کی وجہ سے آنے والے مہاجرین لوگوں کے سماجی مرتبے کے ساتھ ساتھ ان کے انداز رہن سہن کا نقشہ بھی اس ناول میں بڑی مہارت سے کھینچا ہے۔ اس خطے میں آنے والے ایسے مہاجرین جن کا تعلق سماجی کے برتر طبقے سے تھا ان کی خواتین خاندانی رکھ رکھاؤ کی حامل تھیں۔ ان کی ہنر مندی اور سماجی حیثیت ہجرت کے سانحات سہنے کے باجود قائم رہی۔ یہ خواتین گھریلو امور میں طاق تھیں۔ سینا پرونا، کھانا پکانا، گھروں کو سنوارنا سجانا، صفائی اور نفاست، سلیقہ مندی اور ہنر مندی ان خواتین کا طرہ امتیاز تھا۔ یہی وجہ ہے ہجرت کے بعد جب انھوں نے نیلی بار کے خطے میں قدم جمائے تو یہاں بھی وہ اپنی اسی ہنر مندی اور انھی سماجی اوصاف کی پیروی کرتی دکھائی دیں۔ طاہرہ اقبال ان اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والی مہاجر خواتین کے رکھ رکھاؤ اور ان کے سماجی اور خاندانی اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے نیلی بار میں لکھتی ہیں:

> مہاجروں کے چولہے چکنی سے مٹی سے بنے کنگروں میناروں والے، خوب صورت بناوٹوں والے، جیسے کوئی آرائشی ظروف۔ اتنی محنت یہ عورتیں ایک چولہے پر کرتیں۔۔۔۔ یہ گہنوں سے بھی خوب صورت چولہے جیسے بیٹی کے جہیز میں رکھنا ہوا نھیں۔ [۴۳]

طاہرہ اقبال نے اس ناول میں تقسیم کے بعد کی سماجی صورت حال کے نقشے بڑی باریک بینی اور مہارت سے کھینچے ہیں۔ وہ لوگ جو ہجرت کر کے آئے تھے، مقامی آبادی میں ان کو رچنے بسنے میں وقت لگا۔ اس وقت کے دوران میں سماج میں ایک عجیب طرح کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ مہاجر اور مقامی کی سماجی تفریق اس

عہد میں کھل کر سامنے آنے لگی۔ مہاجرین میں ایسے لوگ جو اعلیٰ سماجی طبقات سے تعلق رکھتے تھے، ہجرت نے ان کے سماجی طبقے اور سماجی مرتبے کو بھی متاثر کیا تھا۔ یہ لوگ مقامی لوگوں کی نظر میں قابل رحم تھے۔ وہ ان لوگوں کو طنز کا نشانہ بھی بناتے اور انھیں مہاجر، لٹے پٹے اور پناہ گیر ہونے کے طعنے بھی دیتے تھے۔ طاہرہ اقبال نے ان سماجی رویوں کی عکاسی بھی بھی ناول نیلی بار میں بڑی مہارت سے کی ہے۔ ایک جگہ وہ ان سماجی رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ہائے وہ ظلمیو! پناہیوں کے بالوں کے آگے بھی کچھ ڈالو، وے کھنا کھنا مہاجروں کی جھولی میں پھینکو، وے شوہدے ننگے بھکے اجڑ کے آگئے ہیں، ترس تو کھاؤ غریبوں پر۔[۴۴]

یہ سماجی منظر نامہ ہمیں تقسیم کے بعد مختلف خطوں میں نظر آتا ہے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو طاہرہ اقبال نے اس سماجی منظر نامے میں ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کے سماجی اور خاندانی وقار کو بڑی مہارت سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یہ کامیابی سے دکھایا ہے کہ ہجرت کر کے آنے والے سماجی رکھ رکھاؤ کے حامل گھرانوں میں ہجرت کے بعد بھی وہ تہذیب اور سماجی وقار باقی رہا تھا جو ان کا خاص وصف تھا، جب کہ ان مقابلے میں مقامی خواتین اس سے وقار سے عاری نظر آتی ہیں۔ طاہرہ اقبال سماج کی روح میں اتر اس سماجی فرق کو سامنے لاتی ہیں جو مہاجر خواتین اور مقامی خواتین میں سماجی اقدار سے حوالے سے پایا جاتا تھا۔ ہجرت کے سانحات کو سہہ کر آنے والے لوگوں میں جو تہذیبی اور سماجی وقار تھا وہ مقامی خواتین میں ناپید تھا۔ مہاجر خواتین اپنے مردوں کا نام بڑے شرم وحیا سے لیتی تھیں اور محرم سے بات کرتے ہوئے بھی شرم وحیا کو ملحوظ خاطر رکھتی تھیں لیکن مقامی خواتین کا اس بارے میں جو طرز عمل تھا وہ ان مہاجر خواتین سے یکسر مختلف تھا۔ طاہرہ اقبال اس کی عکاسی نیلی بار میں یوں کرتی ہیں:

> ہائے چندرا، ہائے چندرا، گندا دیس، گندا بھیس، تیمی مرد ایک کھاٹ پر سوئیں توبہ توبہ نرا ننگ، نرا گند، ہائے ربا! لانگھاٹا پاسب دیکھیں نہ غیرت نہ حیا۔[۴۵]

ناول نیلی بار میں مہاجر اور مقامی لوگوں کے سماجی فرق کو کئی حوالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ اس طرز تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ طاہرہ اقبال نے تقسیم کے بعد کے سماج کو صرف ظاہری سطح پر ہی نہیں دیکھا بلکہ انھوں نے اس سماج کے اندر اتر کر ان عناصر کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے جو مہاجر اور مقامی لوگوں میں سماجی حوالے سے تفریق کو سامنے لاتے ہیں۔

طاہرہ اقبال نے نیلی بار کے علاقے کا تعارف کراتے ہوئے اس سماج کے ٹھہراؤ اور اس میں

مدتوں بعد آنے والے تبدیلی کے ایسے جھونکے کا ذکر کیا ہے جو اس کے سماج کو بھی متاثر کرتا ہے۔ نیلی بار کا یہ خطہ ایسی ہی سماجی اقدار کا خطہ ہے جس کے لوگوں کا رہن سہن اور طرز بود و باش دوسرے خطوں سے منفرد اور ممتاز ہے۔ اس خطے میں سماجی سطح پر بڑی تبدیلی اس وقت آئی جب یہاں انگریز کے دور میں نہری نظام مضبوط بنیادوں پر استوار کیا گیا جس کے نتیجے میں لوگوں کے طرز رہن سہن میں تبدیلی آنے کے ساتھ ساتھ اس خطے کی معاشی اور زرعی حالت میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی۔ طاہرہ اقبال اس تغیر کا تذکرہ کرتے ہوئے نیلی بار میں لکھتی ہیں:

> گنجی بار نیلی بار کا یہ علاقہ جس کے آگ اگلتے موسموں میں جنڈ اوکاں، آک کنڈ ریاریاں، تھور کیکروں، سرکنڈوں، بھکڑا کنیر جیسے سخت جان پودے پیر ہی بچ پاتے تھے یا پھر اس بار کے یہ سخت جان وسنیک جو گوہ، کوبرا سانپ، خارپشت، جھاچوہوں، لومڑوں اور بھیڑیوں، سؤروں کے ہمراہ جیتے تھے، جہاں بھوک، قحط اور موت کے معمول کے علاوہ کبھی صدیوں برسوں میں کوئی حادثہ رونما ہوتا جب پتھر سی جامد زندگی کوئی کروٹ بدلتی۔ ایسی ہی ایک کروٹ مدتوں پہلے رونما ہوئی تھی جب انگریز نے یہاں نہریں نکالیں۔ راجباہ اور کھال کھدے، لال پہاڑی بجری اور سرمئی میدانی مٹی گھلا پانی زرخیز زمینوں کے خشک حلق سیراب کرنے لگا۔ دیسی گندم اور نرمے کی قدآور فصلیں لہلہانے لگیں۔[۴۶]

اس اقتباس سے ایک طرف نیلی بار کے علاقے کے طرز بود و باش سے آگاہی ہوتی ہے تو دوسری طرف اس پسماندہ علاقے کی پسماندگی کے اس دور کا بھی پتہ چلتا ہے جب وہاں کے لوگ جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ طاہرہ اقبال نے اس ناول میں جس طرح عصری تاریخ کو ایک تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے اسی طرح انھوں نے سماجی صورت حال کو بھی ارتقائی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس عمل سے ایک طرف تو سماجی حالات کی تصویر سامنے آجاتی ہے تو دوسری طرف عہد بہ عہد بدلتی ہوئے سماجی منظر نامے سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

نیلی بار اور پنجاب کے دیگر کئی علاقوں کے دیہاتوں میں خواتین ایسے ایسے کاموں میں مہارت رکھتی ہیں جو شہری زندگی میں نہیں پائے جاتے۔ جس خطے اور جس عہد کی عکاسی اس ناول میں ملتی ہے اس خطے میں گاؤں کی زندگی خاصی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ فطرت کے بہت قریب بھی ہے۔ وہاں کے باسی فطری اندازِ زیست اپنائے ہوئے ہیں اور فطرت کی رنگینیاں ان کے انداز تعمیر میں بھی نظر آتی ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد اس خطے میں بسنے والے افراد کی عورتوں کی ان سماجی اقدار اور ان کی فطرت سے ہم آہنگی کی عکاسی طاہرہ

اقبال نے ان عورتوں کے روزمرہ کے کاموں میں سے تلاش کر کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ عورتیں جس سماج کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اس کا ایک نقشہ ان خواتین کے ہنر مند ہاتھوں سے یوں تشکیل پاتا ہے:

> ان کی عورتیں صفائی ستھرائی، سجاوٹ، سیناپرونا، کھانا پکانا جانتی تھیں۔ کچے کوٹھے کی لپائی میں ماہرانہ بیل بوٹے تراشتیں اور لال نیلا رنگ ملا کر تیکھے نقش ونگار بناتیں۔ چکنی مٹی میں نیل ملا کر چولہا چوکا پوتتیں، کنگرے دار راوٹے، بھڑولے اور گھر کیچار دیواری اپنے ہاتھوں اُسارتیں۔[۴۷]

عورتوں کی یہ مہارت زندگی کے ہر شعبے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس ناول میں عورتوں کی ان مہارتوں کی عکاسی اس انداز میں کی ہے ان کے بغیر نیلی بار کے سماج کا تصور ہی محال ہے۔ یہ مہارتیں عورتوں کے اس شوق کی بھی تکمیل کرتی ہیں جو انھیں اپنے سماج میں دوسروں سے منفرد اور دوسروں کی نسبت زیادہ سلیقہ مند نظر آنے کی خواہش سے پھوٹتا ہے۔ عورتیں ان سماجی مہارتوں کے ذریعے اس شوق کی تکمیل او راپنی خواہشات کی تسکین سامان کرتی ہیں۔ یہ شوق فرد سے بڑھ کر معاشرے پر حاوی ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں وہ نچلے طبقے کی لڑکیوں کی اس آزادی کو بھی سامنے لاتی ہیں جس سے اعلیٰ طبقے کی ملکانیاں خاندانی وقار اور پابندیوں کی وجہ سے محروم تھیں۔نیلی بار کی ملکانی اپنی نوکرانیوں کو دیکھ کر یہ حسرت کرتی ہے کہ:

> کاش وہ بھی نوکرانی ہوتی تو کھلی فضاؤں میں سانس لینے کی اسے اجازت ہوتی۔ وہ گھڑولی بھرتی، اس بارات کے ساتھ باہر نکل جاتی وہ بھی لکھاں بکھاں ہوتی۔ وہ بھی کجاوے پر بیٹھتی، گھڑولی سر پر اٹھاتی۔ کھیتوں میں پھٹی چنتی، واڈی کرتی۔ کتنی متحرک اور جاندار زندگی جیتی۔[۴۸]

طاہرہ اقبال کے ناول نیلی بار کا سماجی مطالعہ کرنے سے نیلی بار کے علاقے میں پائی جانے والی وہ سماجی تفاوت اور سماجی طبقاتی تفریق بھی سامنے آتی ہے جو پنجاب کے مختلف علاقوں میں پائی جاتی ہے۔ سماج میں بسنے والے مختلف لوگ ایک دوسرے سے طبقاتی حوالے سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ طبقاتی تفریق کسی نہ کسی سطح پر اکثر معاشروں میں پائی جاتی ہے لیکن اس کی سب سے خراب صورت وہ ہوتی ہے جب بالائی طبقے کے لوگ نچلے طبقے کے لوگوں کا صرف اس وجہ سے استحصال کرتے ہیں کہ وہ ان کے مقابلے میں کم سماجی حیثیت کے مالک ہیں۔ سماج میں پائی جانے والی ایسی تفریق جو سماجی عناصر کے ہاتھوں ہی دوسرے سماجی عناصر کا استحصال کرنے کی طرف بڑھے، کسی طور بھی احسن قرار نہیں دی جا سکتی۔ پنجاب کے سماج میں نچلے اور راعلیٰ طبقے میں سماجی

تفریق کا عنصر اس قدر مضبوط ہو چکا ہے کہ خود نچلے طبقے کے لوگ بھی ذہنی غلامی تک پہنچ چکے ہیں۔ ان کے نزدیک وہ کسی طور بھی اعلیٰ طبقے جسے حقوق کے روادار نہیں ہو سکتے۔ طاہرہ اقبال نے اس سماجی حقیقت کو بڑے ماہرانہ انداز میں اس ناول میں بیان کیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

> بس بی بی جی کہتے ہیں سو نسلیں گزر جائیں تو بھی خون پہچانا جاتا ہے۔ پنچ اور گھٹیا خون اپنی پہچان کرواتا ہے اور اعلیٰ اور خاندانی خون اپنی پہچان کرواتا ہے۔ دونوں کا فرق ایسا ہی ہے جیسا حویلی اور رمہاتر کی جھگی کا۔ .... خاندانی خاندانی ہی رہتا ہے اور پنچ پنچ ہی رہتا ہے زمانہ کتنا ہی اس کے الٹ کیوں نہ چلے۔[۴۹]

سماج کے مختلف طبقات ہوتے ہیں۔ ہر طبقہ اپنی خاص سماجی روایات اور اقدار کا حامل ہوتا ہے۔ ایک زرعی سماج کا مطالعہ کیا جائے تو اس سماج میں جاگیر دار اور کسان کے بڑے سماجی طبقے سامنے آتے ہیں۔ ان دونوں طبقات کی سماجی اقدار اور سماجی روایات میں بھی خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ کسان طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تو صدیوں سے ظلم و استحصال کی چکی میں پس ہی رہے ہیں، جاگیر دار طبقے کو دیکھا جائے تو اس طبقے میں مرد اور عورت کے درمیان ایک ایسی خلیج سامنے آتی ہے جو عورت کا استحصال ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ سماج میں بسنے والے یہ جاگیر دار عورت کو اپنی زر خرید لونڈی سمجھتے ہیں۔ سماجی تفاوت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ بیٹیوں کی شادیاں صرف اس وجہ سے نہیں کی جاتیں کہ کہیں جاگیر تقسیم نہ ہو جائے۔ مرد کی طرح عورت بھی جنسی جذبات کی حامل ہوتی ہیں جن کی تسکین کا ذریعہ ہونا ضروری ہے۔ اگر ان جذبات کی تسکین کی بجائے ان کو دبانے کی کوشش کی جائے تو بعض اوقات تو یہ دب جاتے ہیں لیکن اگر ان میں بغاوت پیدا ہو جائے تو پھر سماجی مراتب بھی ان کی راہ نہیں روک سکتے۔ طاہرہ اقبال نے اس جاگیر دار طبقے کی سماجی روایات کا باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہوئے صفورہ نامی لڑکی کے ذریعے ان کی سماجی حیثیت اور مرد اور عورت کے درمیان پائی جانے والی سماجی تفاوت کو بھی نمایاں کیا ہے۔ صفورہ ایک ایسی لڑکی ہے جو نہ صرف جاگیر دار طبقے سے تعلق رکھتی ہے بلکہ سیاسی حوالے سے مضبوط پس منظر کی حامل ہے۔ وہ تمام اقدار اور اعلیٰ سماجی طبقے میں ہوتی ہیں اس کے خاندان کو بھی وراثت میں ملی ہیں۔ اگرچہ اسے ہر طرح کا عیش و آرام میسر ہے لیکن مرد اور عورت کی سماجی تفاوت کی بھینٹ چڑھتی یہ لڑکی اپنے جنسی جذبات کی تسکین کے لیے غلط قدم اٹھاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں حاملہ ہو جاتی ہے۔ فتح شیر صاحب جو اس کا بھائی اور مجلس قانون ساز کا رکن ہے وہ اپنی خاندانی عزت اور وقار کی خاطر اسے دھوکے جنگل میں بھیج کر قتل کروا دیتا ہے۔ یوں یہ جاگیر دار طبقہ اپنی اس سماجی خصلت کو سامنے لاتا ہے جس میں جینے اور سماجی حیثیت منوانے کا حق صرف مرد کو ہے۔ ناول نیلی بار کے مطالعہ سے

ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا صرف صفورہ کے ساتھ ہی نہیں ہوتا بلکہ صفورہ جیسی کئی اور لڑکیاں بھی ایسی ہیں جو اسی جاگیرداری سماج کی بھینٹ چڑھ کر ساری عمر سسکتی رہتی ہیں اور کوئی ان کی آواز سننے والا نہیں ہوتا۔ طاہرہ اقبال نے ذیلدار ملک صاحب کی بیٹی بختاور کے کردار کے ذریعے بھی اس جاگیردار سماج کی عکاسی کی ہے۔ بختاور جس سماج میں پروان چڑھی اور جس طرح کی خاندانی رسومات اور روایات کا اس کو سامنا کرنا پڑا ان سے بھی اسی جاگیرداری سماج کی عکاسی ہوتی ہے۔ بختاور نے ساری عمر کسی مرد کی شکل نہیں دیکھی ہوتی۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح زندگی گزارنے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن اسے اپنی ملازماؤں سے بھی بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایک دن ملازمہ سے بات کرتے ہوئے اس کی ماں دیکھ لیتی ہے اور اسے ڈانٹتی ہے تو وہ ڈر کے مارے گودام نما کمرے میں چھپ جاتی ہے۔ اس واقعے پر اس کا باپ جو ردعمل دیتا ہے، وہ اسی جاگیرداری سماج کی عکاسی کرتا ہے جو پدرسری سماج قرار پاتا ہے جس میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بختاور کا باپ اس کی ماں کو اس کارنامے پر شاباش دیتے ہوئے کہتا ہے:

> رہنے دو اسے ڈر کے ڈربے میں بند رہنے دو، سزا سے سزا کا خوف زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ کل اسے کہنا کہ تم نے مجھے کچھ نہیں بتایا لیکن آئندہ غلطی ہوئی تو پھر تم مجھے بتاؤ گی اور اسے وہ سزا ملے گی کہ یاد رکھے گی ۔۔۔ تمام کام والیوں کو کان کردو کہ اگر دوبارہ کوئی بختاور سے بات کرتے ہوئے پکڑی گئی تو تندور میں ڈلوادیں گے۔[۵۰]

طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں کئی جگہوں پر اس پدرسری سماج کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ جاگیردار طبقہ جو سماج کے کمزور طبقے کی عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کو ناجائز طریقے سے اپنے بستر کی زینت بنانے سے بھی نہیں کتراتا، اپنی بیٹیوں کو جائز طریقے سے بھی دوسروں کے نکاح میں نہیں دیتا کہ کہیں جائیداد اور جاگیر تقسیم نہ ہو جائے۔ بختاور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے جگہ جگہ اسے اپنے ہی باپ اور گھر والوں کے خوف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور آخر اسی خوف کے ہاتھوں وہ موت کے منہ میں چلی جاتی ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس پدرسری سماج اور اس کی روایات کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

> ہائے ہائے ان محلوں سے بیٹیوں کے ڈولے نہیں اٹھتے جنازے اٹھتے ہیں۔ ان کی کھاٹ کہار اٹھاتے ہیں۔ یہ ڈر کی سیج پر آپ ہی پھاہی لگتی ہیں۔ یہ پردے کی چادر میں ڈر کی بکل مار کر چپ چیتے مر جاتی ہیں۔[۵۱]

اور ان بیچاریوں کا مرنا بھی سوگ کی بجائے ان کے بڑوں کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بوجھ تھا لڑکی کی زندگی کا جو ہمیشہ کے لیے ایک کسک بنا ہوا تھا۔ اچھا ہوا، مر گئی جان چھوٹی۔ زمانہ جاہلیت میں جس طرح لڑکی کو بوجھ اور مصیبت سمجھا جاتا تھا اس پدرسری جاگیرداری سماج میں بھی لڑکی کی حیثیت وہی ہے۔ طاہرہ اقبال نے نہ صرف اس سماج میں عورت کی زندگی کو ایک مصیبت اور عذاب کے طور پر دکھایا بلکہ اس کی موت کو اس کے باپ، بھائیوں کے لیے خوشی اور مسرت کا باعث بنتے بھی دکھایا ہے۔ بختاور جب خوف میں مبتلا ہو کر مر جاتی ہے اور اپنے ارمانوں کو اپنے ساتھ ہی قبر میں لے جاتی ہے تو اس موقع پر اس کے ذیلدار باپ ملک صاحب کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ طاہرہ اقبال اس کی اس مسرت کی عکاسی اس کے الفاظ میں یوں کرتی ہیں:

> میری بچی! میں تیرا بڑا شکر گزار ہوں تو نے مجھے کسی کمینے کے سامنے سر جھکانے پر مجبور نہیں کیا۔ تو نے مر کر مجھ پر بڑا احسان کیا، اب میں باقی ماندہ زندگی سر اٹھا کر چلنے کے قابل رہوں گا۔ شکریہ میری بچی شکریہ۔[۵۲]

بختاور اور صفورہ جیسی کئی لڑکیاں ہیں جو جاگیرداری نظام کا ایک عنصر ہونے کے باوجود ایک ایسے وجود کی مانند ہے جس سے یہ نظام جلد از جلد چھٹکارہ حاصل کر لینے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں پنجاب کے جاگیرداری نظام کا نقشہ کھینچتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ جاگیردار کے ہاں اس کی جاگیر سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ بیٹیاں اور بہنیں جن کے کئی ارمان ہوتے ہیں، اس جاگیرداری نظام کی بھینٹ چڑھ کر وہ ارمان ان کے ساتھ ہی منوں مٹی تلے دفن ہو جاتے ہیں۔ دیہاتی پس منظر کے اس ناول میں طاہرہ اقبال نے دیہات کے لوگوں کی سماجی اقدار کو بڑی باریک بینی سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح دیہات میں سماجی اقدار شہر سے مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی خاص انفرادیت بھی رکھتی ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو طاہرہ اقبال کے ناولوں میں ثقافتی، تہذیبی، مذہبی اور سماجی اقدار کی عکاسی بڑے جاندار انداز میں ہوئی ہے۔ انھوں نے پنجاب کے دو مخصوص خطوں پوٹھوہار اور نیلی بار کو سامنے رکھتے ہوئے سماجی، ثقافتی اور مذہبی عناصر کو بڑی مہارت سے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے ہاں ان اقدار کی عکاسی تخیل سے زیادہ اس تجربے کی دین ہے جس سے اس سماج کے اندر رہتے ہوئے وہ خود گزری ہیں۔ ان کے ناول پنجاب کی تہذیب و ثقافت اور سماجی اقدار کے عمدہ مرقعے پیش کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ المنجد، الاشاعت (کراچی: اردو بازار، جولائی ۱۹۷۵ء)، ص ۳۷۸۔

۲۔ مصباح اللغات (کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، ایم اے جناح روڈ، مارچ ۱۹۸۲ء)۔

۳۔ جمیل جالبی، پاکستانی کلچر (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء)، ص ۴۲۔

۴۔ *Oxforf English dictionary* جلد دوم (لندن: آکسفورڈ، کلرینڈن پریس، ۱۹۶۱ء)، ص ۱۴۸۲۔

۵۔ ایڈورڈ بی۔ ٹیلر (Edward B.Tylor)، *Primative Culture*، شمارہ نمبر ۱ (لندن: جان مرے لمیٹڈ، ۱۸۷۱ء)، ص ۱۔

۶۔ آر لنٹن (R. Linton) (مرتبہ) *The Science of Man in the world crisis*، (کولمبیا یونی ورسٹی پریس، ۱۹۴۵ء)، ص ۱۴۔

۷۔ ایس ایم یوسف، اسلامک کلچر (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، ۱۹۷۸ء)، ص ۱۔

۸۔ ایس ایم یوسف، اسلامک کلچر، ص ۱۔

۹۔ طاہرہ اقبال، گراں (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۵۔

۱۰۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۴۵۔

۱۱۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۵۱۔

۱۲۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۲۶۔

۱۳۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۳۱۔

۱۴۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۱۔

۱۵۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۲۔

۱۶۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۲۵۔

۱۷۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۲۵۔

۱۸۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۲۶۹۔

۱۹۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۷۔

۲۰۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۳۸۴۔

۲۱۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۲۸۷۔

۲۲۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۲۹۰۔

۲۳۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۳۱۸۔

۲۴۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۳۲۰۔

۲۵۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۳۲۰۔

۲۶۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۳۲۱۔

۲۷۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۳۲۱۔

۲۸۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۳۲۷۔

۲۹۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۳۲۸۔

۳۰۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۳۲۳۔

۳۱۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۳۲۴۔

۳۲۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۲۲۱۔

۳۳۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۲۱۸۔

۳۴۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۱۸۲۔

۳۵۔ ایلنز فریڈرک کولن(Allans Frederick Kullen)، *Webster,s new illustrated dictionary*،(نیویارک: رینسٹ بکس،۱۹۷۰ء)،ص۶۲۸۔

۳۶۔ انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں(کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان ، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۲۔

۳۷۔ طاہرہ اقبال، گراں،ص۱۵۔

۳۸۔ طاہرہ اقبال، گراں،ص۳۴۔

۳۹۔ طاہرہ اقبال، گراں،ص۳۶۔

۴۰۔ طاہرہ اقبال، گراں،ص۴۳۔

۴۱۔ طاہرہ اقبال، گراں،ص۴۷۔

۴۲۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۱۳۔

۴۳۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۲۶۸۔

۴۴۔ طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۲۱۔

۴۵۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۹۔

۴۶۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۲۔

۴۷۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۳۔

۴۸۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۲۳۔

۴۹۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۷۵۔

۵۰۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۱۹۔

۵۱۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۹۴۔

۵۲۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۹۵۔

باب چہارم

ناول نیلی بار اور گراں میں تاریخی و سماجی عناصر کا تقابلی جائزہ

باب چہارم:

ناول گراں اور نیلی بار میں تاریخی و سماجی عناصر کا تقابلی جائزہ

طاہرہ اقبال کے ناول گراں اور نیلی بار کا تفصیلی تنقیدی جائزہ ہم گزشتہ ابواب میں پیش کر چکے ہیں۔ ایک تخلیق کار جب لکھ رہا ہوتا ہے تو اس پر بہت سے سیاسی، سماجی اور تاریخی عوامل اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ عوامل اس کی مختلف تخلیقات پر مختلف انداز میں اثرات مرتب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک تخلیق کار کی مختلف تخلیقات میں ایک طرف بہت سے اشتراکات دکھائی دیتے ہیں تو دوسری طرف کئی حوالوں سے افتراکات بھی سامنے آتے ہیں۔

ناول ایک وسیع کینوس کی صنف ہونے کی وجہ سے اپنے دامن میں بہت سے سیاسی، سماجی، تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی امور کو سموئے ہوتا ہے۔ یہ ایسے عوامل ہوتے ہیں جن سے متاثر ہو کر کسی تخلیق کار نے ناول تخلیق کیا ہوتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو بہت سے ایسے ناول نگار سامنے آتے ہیں جنھوں نے ایک زیادہ ناول تحریر کیے ہیں۔ ایک ناول نگار کے مختلف ناولوں میں فکری و موضوعاتی فرق ہونے کے باجود بعض حوالوں سے اشتراکات بھی سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ موضوع، سیٹنگ اور زمان و مکان ایسے عوامل ہیں جو ایک ناول کو دوسرے سے منفرد اور الگ کرتے ہیں تاہم ناول نگار کے ذہنی رجحان کی وجہ سے افتراکات اور اشتراکات دونوں کسی نہ کسی تناسب سے مختلف ناولوں میں چلتے رہتے ہیں۔ طاہرہ اقبال کا شمار بھی ایسی ناول نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے عہد کے سیاسی و سماجی منظر نامے کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس منظر نامے کو ناولوں میں سموتے ہوئے انھوں نے زندگی کو کئی حوالوں سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول ہمیں زندگی کی رعنائیوں کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے سیاسی منظر نامے اور تاریخی تناظر سے بھی ہم آشنا کرتے ہیں۔ یہ آشنائی طاہرہ اقبال کے مطالعہ کی وسعت کے ساتھ ساتھ ان کے ناولوں میں مخصوص خطوں کی ثقافت، سماج اور سیاست کے مشاہدہ کی بھی دین ہے۔ ایک پختہ کار ناول نگار کی طرح انھوں نے اپنے ناولوں میں جن خطوں کی کہانیوں کو موضوع بنایا ہے، ان خطوں کے سیاسی و سماجی منظر نامے کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ سے بھی خوب کام لیا ہے۔ ان کے ناولوں ماضی کی بجائے معاصر تاریخ کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ وہ تاریخ ہے جو پاکستان بننے کے بعد شروع ہوتی ہے اور پے در پے بدلتے ہوئے واقعات اور حالات سے مرتب ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ناولوں گراں اور نیلی بار میں ان مخصوص خطوں کی تہذیب، سماجی اقدار

اور ثقافتی روایات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس باب میں ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ طاہرہ اقبال کے دونوں ناولوں گراں اور نیلی بار میں جن خطوں کی کہانی بیان کی گئی ہے اور جس طرح تاریخی اور سماجی منظر نامے کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، اس میں دونوں ناولوں میں کس حد تک اشتراکات پائے جاتے ہیں اور کون کون سے افتراکات سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں طاہرہ اقبال کے دونوں ناولوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے جس میں تاریخی اور سماجی تناظرات کو سامنے رکھا گیا ہے۔

ناول گراں اور نیلی بار میں تاریخی عناصر کا تقابلی جائزہ:

تاریخ صرف گزرے ہوئے واقعات کے بیان کا نام ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک کثیر الجہات عمل ہے جس میں ہم کسی قوم یا خطے کے ارتقائی سفر کی تفہیم بھی کرتے ہیں اور اس سفر کے دوران پیش آنے والے نشیب و فراز سے بھی آشنا ہوتے ہیں۔ تاریخ کا عمل ہر دور میں جاری رہتا ہے۔ ماضی کی تاریخ کو اردو ناول کا موضوع بنانے والے ناول نگاروں کی تعداد خاصی ہے جس کی وجہ سے اردو ناول میں تاریخ کے بیان کی ایک مضبوط روایت سامنے آتی ہے۔ جدید عہد میں بعض ایسے ناول نگار بھی سامنے آئے ہیں جنھوں نے معاصر تاریخ کو ناول کا موضوع بنایا ہے۔ یہ ایسی تاریخ ہے جو تخلیق کار کے عہد کی تاریخ ہوتی ہے یا اس کے عہد سے چند سال قبل سے شروع ہوتی ہے جس کے اثرات خود تخلیق کار کے قلب و ذہن پر بھی کسی نہ کسی حوالے سے مرتب ہوئے ہوتے ہیں۔ تخلیق کار جس عہد کی کہانی بیان کر رہا ہوتا ہے اور کہانی کے جن کرداروں کی تشکیل کر رہا ہوتا ہے وہ عہد اس نے خود جھیلا ہوتا ہے، جو کردار سامنے آ رہے ہوتے ہیں وہ اس کے عہد سے ہی جنم لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو ان کرداروں یا ان میں سے کسی ایک کردار میں خود تخلیق کار کی ذات بھی دخول کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماضی کی تاریخ کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ معاصر تاریخ کو ناول میں سمونے کا رجحان بھی اردو ناول میں خاصا مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ اس تاریخ میں تخلیق کار کے ایک ناظر کے طور پر سامنے آنے اور معاصر حالات و واقعات کو خود جھیلنے کے وجہ سے اس کی تحریر میں جو بے ساختگی اور حساسیت پائی جاتی ہے، وہ ماضی کی تاریخ کو موضوع بنانے کی نسبت زیادہ شدت کی حامل ہوتی ہے۔

طاہرہ اقبال کے اب تک دو ناول گراں اور نیلی بار سامنے آ چکے ہیں۔ ان ناول کا تاریخی تناظر میں تقابل کیا جائے تو ان میں اشتراکات کی نسبت افتراکات زیادہ سامنے آتے ہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ ناول نگار کے پاس نہ مشاہدے کی کمی ہے اور نہ ہی موضوعات کو دہرانے کو کوئی رجحان پایا جاتا ہے۔ تاریخی

حوالے سے ان دونوں ناولوں کا تقابل کیا جائے تو ان میں نیلی بار اپنے عہد کی کسی حد تک مکمل تاریخ ایک مربوط انداز میں سامنے لاتا ہے۔ اگرچہ اس ناول میں انھوں نے نیلی بار کے خطے کو موضوع بنایا ہے تاہم اس کی تاریخی وسعت تقسیم ہند کے وقت فسادات سے لے کر جنرل مشرف کے مارشل لا اور پھر نام نہاد جمہوریت کا ڈول ڈالنے تک دکھائی دیتی ہے۔ گویا انھوں نے معاصر تاریخ کا بڑی کامیابی سے اس ناول میں محاکمہ پیش کیا ہے۔ اس ناول کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ادب اور تاریخ کے تعلق کو مضبوط بناتے ہوئے اس ناول کے ذریعے معاصر تاریخ کو ادبی انداز میں محفوظ کرنے کی غرض سے ہی ناول لکھ رہی تھیں۔ اگرچہ انھوں نے پس منظر کے طور تقسیم ہند کو بھی اس تناظر میں دیکھا ہے تاہم تاریخ کا اصل دھارا اس ناول میں جنرل ایوب خان کے مارشل لا کے دور سے بہتا دکھائی دیتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس ناول میں تاریخ بیان کرتے ہوئے تاریخی واقعات کے سماج پر پڑنے والے اثرات اور پھر ان اثرات کی وجہ سے سماجی سطح پر پیدا ہونے والے رد عمل کو بھی نمایاں کیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس ناول میں تاریخ اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بن کر سامنے آتے دکھائی دیتے ہیں۔ جنرل ایوب کے دور میں اصلاحات کے ساتھ ساتھ سماج پر جو سخت گیری نافذ تھی وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ ایک ناول نگار جب ناول تخلیق کر رہا ہوتا ہے اور خاص طور پر اس کا تاریخی تناظر زیادہ وسعت اختیار کر رہا ہو تو لازم امر ہے کہ ناول نگار باوجود کوشش کے ہر تاریخی واقعے کو ناول میں بیان نہیں کر سکتا۔ اسے واقعات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اور پھر منتخب کیے گئے واقعات کو ادبی چاشنی کے ساتھ ایک ربط کے ذریعے بیان کرنا ہوتا ہے۔ طاہرہ اقبال کے ہاں ہمیں نیلی بار میں معاصر تاریخ بیان کرنے کا یہ انداز زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے کہ وہ بعض تاریخی واقعات کو سیدھے اور صاف انداز میں بیان کرتی چلی جاتی ہیں، لیکن بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کو براہ راست بیان کرنے کی بجائے سماج پر ان واقعات کے اثرات کے ذریعے ناول میں ان کی شمولیت یقینی بناتی ہیں۔ انھوں نے جہاں جنرل ایوب کے عہد کی تاریخ کو بیان کرتے ہوئے اس حاکم وقت کی طرف سے زندگی کے مختلف شعبوں میں ہونے والی اصلاحات کو بیان کیا ہے۔ وہاں جنرل ایوب کے دور میں سماجی سطح پر انٹیلی جنس ایجنسیوں کے کردار اور مشکوک افراد کی سرکوبی کے لیے کی جانے والی خفیہ کوششوں کو بھی سماجی اثرات کے ذریعے ناول کا حصہ بنایا ہے۔ اس کے ساتھ عوام میں جمہوری حکمرانوں کی بجائے فوجی جرنیل کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنے اور اسے اپنا خیر خواہ سمجھنے کا شعور اجاگر کرنے عمل بھی سماجی کرداروں کی ذریعے یوں سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ مربوط انداز میں آگے بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔ اس عمل کی وجہ سے ناول کا تاریخی تناظر خاصا مربوط اور مضبوط ہو گیا ہے۔

اس وقت فوجی جو تاریخی اہمیت اختیار کر چکے تھے، اس کا اندازہ ایک ریٹائرڈ فوجی کی بات چیت اور لوگوں کے اس پر اندھے اعتماد سے بھی سامنے آتی ہے۔ ناول نیلی بار سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> فوجی آٹھ جماعتیں پڑھا تھا اور برما کے محاذ پر انگریزوں کی بڑی جنگ لڑی تھی۔ وہ ذیلدار صاحب کے بعد گاؤں کا سب سے پڑھا لکھا اور سمجھدار آدمی تھا۔ وہ ان پڑھ دیہاتیوں کو ملکی و عالمی خبریں سمجھاتا رہتا۔ اس لیے اس کی بیٹھک میں ریڈیو کے گرد مجمع بڑھنے لگا تھا اور فوجی کی آواز جوش خطابت میں بلند ہوتی جا رہی تھی۔
>
> اوئے نالائقو، ان پڑھو! تمھیں کیا پتہ کہ تمہارے حق میں کتنا اچھا ہوا ہے۔ پہلی بار سرکار نے تمہارے حق حقوق کی بات کی ہے۔ ایک جرنیل تمہارا بادشاہ بنا ہے۔۔۔[1]

اس اقتباس سے نیلی بار کے تاریخی تناظر کے حوالے سے کئی چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو فوجی کی تعلیم آٹھ جماعتیں پاس بتا کر طاہرہ اقبال قاری کو اس عہد میں لے گئی ہیں جس عہد میں آٹھ جماعتیں پڑھا ہونا بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہونا گنا جاتا تھا۔ دوسری جانب اس کے فوج سے تعلق کی وجہ سے اس کی بات کی اہمیت فوجی جرنیل کی حکومت میں فوج کے مورال کو بھی سامنے لاتی ہے۔ پھر جمہوریت کے نتائج بھگتنے والی قوم کو آمریت میں خیر دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو نیلی بار میں براہ راست بیان کرنے کی بجائے کرداروں اور سماجی اثرات کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہیں سے اس ناول کا تاریخی تناظر مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہو کر آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

نیلی بار کے برعکس گراں میں تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس ناول میں ہمیں نیلی بار کی طرح تاریخ مربوط انداز میں یا دوسرے لفظوں میں "نیلی بار" کی طرح ناول کا اہم موضوع بنتی دکھائی نہیں دیتی۔ اس کے علاوہ دونوں ناول میں تاریخ کے آغاز کے حوالے سے دیکھا جائے تو گراں میں تاریخی عمل نیلی بار کے تاریخی عمل سے پہلے شروع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ گراں میں طاہرہ اقبال نے تقسیم ہند کے قبل کے عہد کے تاریخی واقعات کو ناول کے پہلے باب میں بیان کرنے کے تقسیم سے قبل کے تاریخی منظر نامے سے آگاہی دلائی ہے۔ اس تاریخی منظر نامے کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے سماج کے مختلف کرداروں کے بیانات اور آپس کی بات چیت کے ذریعے ہی تاریخ کے دھارے کو ناول میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے نوآبادیاتی عہد کی امن وامان کی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے اس امن وامان کے سماجی اثرات کو ناول میں بیان کیا ہے۔ کرداروں کے ذریعے ان سماجی اثرات کے اظہار کے ذریعے ہی قاری ہندوستان کے نوآبادیاتی عہد کی تاریخ سے

آشنائی حاصل کرنے لگتا ہے۔ مختلف عورتوں کا آپس میں باتیں کرتے ہوئے انگریزی عہد میں لوٹ مار سے بچاؤ اور امن وامان کی بہترین صورت حال کی عکاسی کرنا ہندوستان کی تاریخ کے نوآبادیاتی عہد کے اہم زاویے کو سامنے لاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گراں میں ایک تو تاریخ کا آغاز زمانی اعتبار سے ناول نیلی بار سے پہلے ہوتا ہے، دوسرا اس ناول میں براہ راست بیان کی بجائے تاریخی حقائق کے سماجی اثرات کے ذریعے قاری کو تاریخ کے گوشوں سے آشنائی دلانے کی کوشش کی گئی ہے جب کہ نیلی بار میں اگرچہ آغاز میں کسی حد تک یہ رجحان ملتا ہے تاہم آگے چل کر وہ تاریخی حقائق کو حقیقی کرداروں کے ذریعے براہ راست بیان کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ گراں اور نیلی بار کے تاریخی تقابل میں قاری کو دونوں ناولوں میں تاریخ کے زمانی آغاز کے حوالے سے یہ فرق واضح دکھائی دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناول نگار نے گراں کے تاریخی تناظر کی بنیاد تقسیم سے قبل کی ہندوستانی تاریخ کو بنایا ہے اور نیلی بار میں یہ بنیاد تقسیم کے بعد کے تاریخی واقعات خاص طور پر جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت میں مضبوط ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں ناولوں میں تاریخی حوالے سے پہلا بڑا فرق تاریخ کا زمانی اعتبار سے آغاز ہے۔

ناول گراں میں طاہرہ اقبال نے ہندوستان کی تقسیم سے قبل کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ہندوستان کی تقسیم تک آئی ہیں۔ تقسیم کے عمل کے فوراً بعد سماج میں جو فکری رجحانات پروان چڑھے تھے ان میں سب سے بڑا اور اہم رجحان ماضی کی یاد تھا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کے ہندوستان میں کاروبار بھی تھے اور وہ روزگار کے دیگر ذرائع سے بھی وابستہ تھے۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد سب کچھ چھوڑ کر جب وہ پاکستان آئے تو ابتدائی طور پر انھیں مہاجر کیمپوں میں ٹھہرنا پڑا۔ یہ اذیت ناک لمحات تھے۔ جنھوں نے ان مہاجرین کو فکری طور پر بہت متاثر کیا۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو ہندوستان میں رہنے کے دوران میں یہ لوگ ہندوؤں، سکھوں اور دیگر اقوام کے ساتھ صدیوں سے نسل در نسل رہتے چلے آرہے تھے۔ مختلف حکمران اس خطے پر آئے جن میں مسلمان بھی تھے اور غیر مسلم بھی، طرزِ حکمرانی میں کئی حوالوں سے تبدیلیاں آتی رہیں لیکن ان مختلف اقوام کا باہمی انجذاب اور سماجی تعلق کسی طرح کمزور نہ پڑنے پایا تھا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کا حصہ بن چکا تھا اور ہندوستان کی کوئی بھی تاریخ اس کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ تقسیم کے بعد یہ تاریخ بنا بنایا سماجی منظر نامہ ہجرت کرنے والوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا انھیں بہت رنج تھا۔ طاہرہ اقبال نے ناول گراں کے مختلف کرداروں کے ذریعے اس تاریخی منظر نامے کی جھلک دکھائی ہے۔ یہاں انھوں نے براہ راست اس منظر نامے میں لے جانے کی بجائے اس کے چھن جانے یا معدوم ہو جانے کے بعد لوگوں کی یاد اور ان کے حافظے میں اس کی موجودگی سے کام لیا

ہے۔ ان کا طرزِ بیان ایسا ہے کہ کردار کے ذریعے وہ پورا نقشہ یوں کھینچ کر رکھ دیتی ہیں کہ قاری خود کو تاریخ کے اس لمحے میں کھڑا محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کے ناول گراں کے کردار ایک طرف ماضی کی اس تاریخ کو یاد کرتے ہیں تو دوسری طرف اس کے معدوم ہو جانے اور دوستی کے تعلق کو دشمنی میں بدلتے دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتے بھی رہتے ہیں۔ انھیں اپنی زمینوں کے چھٹ جانے اور جائدادوں سے محروم ہو جانے سے زیادہ تاریخ کے ان لمحات کے معدوم ہونے کا غم کھائے جاتا ہے۔ اس کی مثال ناول گراں کے ایک کردار کی گفتگو سے یوں سامنے آتی ہے:

> ہائے بیچاری ہندوانیاں اور سکھنیاں گھٹے گھٹے مکانوں کے تھڑوں پر بیٹھی ساری دیہاڑی چرخہ کاتتیں۔ دونوں بانھیں سونے کے چوڑوں سے بھری ہوئیں، جی بھر کے لٹ پڑی۔ بانھیں کان بھی خالی ہوئے، بھرے گھر خالی ہوئے، ہائے بیٹھے بٹھائے، صدیوں کے جمے جمائے وسیب میں کیسا واہڑا وگیا (ہل چل گیا)۔ عمروں کے ساتھی ایک دوسرے کو کاٹنے وڈنے لگے۔ ہائے ہائے ظلمی۔[۲]

ہندوستان کی تاریخ کا یہ عمل جس میں مختلف اقوام کے درمیان گہرا تعلق موجود تھا ہندوستان کی تقسیم کی نذر ہو گیا۔ اس تاریخی عمل کے معدوم ہو جانے سے سماجی سطح پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ طاہرہ اقبال نے ناول گراں میں انھی سماجی اثرات کو سماجی کرداروں کے ذریعے سامنے لا کر ہندوستان کی تقسیم سے قبل کی تاریخ کو ناول میں سمویا ہے۔ یہی عمل گراں اور نیلی بار کے تاریخی تقابل میں زیادہ واضح ہوتی ہے کہ ناول گراں معاصر تاریخ کی بجائے ہمیں ماضی کے تاریخی حقائق سے آگاہی دلاتا ہے جب کہ ناول نیلی بار میں انھوں نے معاصر تاریخ کو موضوع بنایا ہے۔ ماضی کی تاریخ اور معاصر تاریخ کے بیان میں ایک بڑا فرق نفسیاتی حوالے سے بھی سامنے آتا ہے۔ تخلیق کار جب ماضی کی تاریخ بیان کر رہا ہوتا ہے تو اس کے کردار ماضی کے اچھے لمحات اور خوشگوار یادوں کے چھن جانے سے نفسیاتی سطح پر متاثر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان میں ناسٹلجیائی کیفیات پیدا ہونے لگتی ہیں جب کہ معاصر تاریخ کو ادب یا خاص طور پر ناول میں سمونے والے کے کرداروں ناسٹلجیائی کیفیات نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی تقابل کے دوران میں ہمیں ناول گراں کے کردار ماضی سے متاثر اور ماضی کی یاد میں کھوئے دکھائی دیتے ہیں اس کے برعکس ناول نیلی بار کے کرداروں کے ہاں ماضی میں چلے جانے یا ناسٹلجیائی کیفیات کا شکار ہو جانے کا رجحان بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

ناول گراں اور نیلی بار کے تاریخی تقابل کے دوران ان دونوں ناولوں کے ابتدائی ابواب میں

ان افتراکات کے ساتھ ساتھ کچھ اشتراکات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ ایسے اشتراکات ہیں جو تاریخی واقعات کے مشترک ہونے کی وجہ سے ناول نگار کے شعور کا حصہ بن کر اس کے دونوں ناولوں میں سامنے آئے ہیں۔ان اشتراکات کو دیکھا جائے تو سب سے اہم مشترک تاریخی تناظر تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں ترک سکونت کے سانحات کا ہے۔ وہ فسادات جو تقسیم کے وقت رونما ہوئے اور ان میں ترک سکونت کرنے والوں نے جس طرح اپنے مال اسباب کے ساتھ ساتھ عزت وناموس اور جانوں کی قربانی بھی دی تاریخ میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں میں سے بہت سے ایسے لوگ تھے جو منزل کی جستجو میں نکلے تو ضرور تھے لیکن منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ دوسروں کے ہاتھوں موت کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ یہ ایسا دردناک سانحہ تھا جس کے خون کے دھبے کبھی بھی ہندوستان کی تاریخ سے مٹ نہیں سکیں گے۔ طاہرہ اقبال کے دونوں ناولوں گراں اور نیلی بار میں اس تاریخی سانحے کی عکاسی ملتی ہے ۔یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تقسیم ہند اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فسادات تاریخ کا ایسا واقعہ ہے جس نے زندگی کے ہر شعبہ کے افراد کو جسمانی اور فکری طور پر متاثر کیا تھا۔ صدیوں سے جما جمایا سماج اور اس کی اقدار نہ صرف بدل گئیں بلکہ ان میں پیدا ہونے والی تبدیلی کی نوعیت کا کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ کسی کو اس امر کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس طرح حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اپنی جڑوں سے اکھڑ جانے کے غم نے زندگی کو ایک نئی جہت عطا کی تھی۔ یہ جہت ناسٹلجیا کے زیر اثر اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ تقسیم ہند کے موضوع یا اس کو ذیلی موضوع بنا کر لکھے جانے والے ناولوں میں اس کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ طاہرہ اقبال کے دونوں ناول کے شروع میں بھی یہ تاریخی واقعہ خاص انداز میں سامنے آتا ہے ۔ طاہرہ اقبال کا اعجاز یہ ہے کہ انھوں نے دونوں ناولوں میں تقسیم اور اس کے سانحات کا ذکر اس انداز میں کیا ہے کہ واقعہ میں اشتراک ہونے کے باجود قاری کو کہیں بھی یہ گمان نہیں گزرتا کہ وہ ایک ہی ناول پڑھ رہا ہے۔ دونوں ناولوں میں اس واقعے کو سماجی اثرات کے زیر اثر یوں سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک ہی تاریخی واقعہ کے متنوع انداز سامنے آتے ہیں۔ یہ ایک بڑے تخلیق کار کی نشانی ہے کہ وہ چیزوں کو دہرانے کی بجائے ان کی گہرائی میں اتر کر ان اسرار کو سامنے لاتا ہے جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ یا اگر عام لوگ کو ان کا مشاہدہ ہوتا بھی ہے تو اس کے سماجی اثرات کی شدت کا اندازہ نہیں کر پاتے۔ طاہرہ اقبال نے ان دونوں ناولوں میں ہندوستان کی تقسیم کے واقعے کو سماجی اثرات کی شدت کے ساتھ ساتھ دونوں ناولوں میں تنوع کے ساتھ پیش کیا ہے۔

طاہرہ اقبال کے ناولوں گراں اور نیلی بار کا تاریخی تقابل کرتے ہوئے جب ہم تقسیم کے بعد کے عہد میں داخل ہوتے ہیں تو یہاں ان کے ناول گراں کا تاریخی کردار مدھم پڑتا دکھائی دیتا ہے جب کہ ناول نیلی بار پوری آب وتاب سے عصری تاریخ کو اپنے دامن میں سموتا چلا جاتا ہے۔گراں میں تاریخ کے دھارے میں بہتی ہوئی جب بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں پہنچتی ہیں تو پوٹھوار کا خطہ جو اس ناول کا موضوع بنا ہے، اس میں معاشی حوالے سے آنے والی تبدیلی ان کا موضوع بنتی ہے۔ اس تبدیلی کے زیر اثر ترک سکونت کا رجحان خاص انداز میں سامنے آتا ہے۔ یہاں تک کہ جس کا بھی کہیں سے بس چلتا ہے اسے اپنی فلاح اور مستقبل بیرون ملک جانے میں ہی نظر آنے لگتا ہے۔ طاہرہ اقبال پوٹھوار کے خطے میں آنے والی اس تبدیلی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ستر کی دہائی تھی جب پوٹھوار میں سے ہر وہ مرد جو اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکا تھا، ہر وہ بچہ جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ پاسپورٹ بنوا کر بیرون ملک کمائی کرنے چلا گیا تھا۔ بڑے بوڑھوں کا خیال تھا۔ پوٹھوار مردوں سے ایسے ہی خالی ہوا ہے جیسے کبھی لام کے زمانے میں اجڑ گیا تھا۔ عوتوں اور قریب المرگ بوڑھوں کے سوا چلتا پھرتا کوئی مرد نظر نہ آتا تھا۔[3]

معاشی استحکام اور بیسویں صدی کی وہ مادیت پرستی جس نے پوری دنیا کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ سوچ کے نئے زاویوں سے آشنائی دلائی، اس کے اثرات پوٹھوار کے خطے پر بھی پڑے۔ یہ ایسی تاریخی تبدیلی تھی جس کے اثرات بعد ازاں پھیلتے ہی چلے گئے اور اب بھی یہ رجحان توانا انداز میں قائم ہے۔ طاہرہ اقبال نے گراں میں ان تاریخی تبدیلیوں کو سماج پر پڑنے والے اثرات کے تناظر میں ان تاریخی واقعات کو ناول کی کہانی میں سمو کر محفوظ کر دیا ہے۔ آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ اس ناول کا تاریخی تناظر سماج میں پیدا ہونے والی تعلیمی تبدیلیوں اور ان تبدیلیوں کے زیر اثر سماج کی بول چال کی زبان میں آنے والی تبدیلیوں تک پھیلتا دکھائی دیتا ہے۔ گویا ناول گراں عصری تاریخ کو براہ راست موضوع نہیں بناتا بلکہ طاہرہ اقبال نے اس ناول میں سماجی تناظر اور تاریخی تناظر کو ایک دوسرے کے ساتھ بڑی مہارت سے بیان کرتے ہوئے تاریخی تبدیلیوں اور سماج پر پڑنے والے ان کے اثرات اور پھر ان اثرات کی وجہ سے سماجی تغیرات کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔

ناول گراں کے برعکس جب ہم عصری تاریخ کے تناظر میں ناول نیلی بار کا جائزہ لیتے ہیں تو اس ناول میں ہمیں عصری تاریخ پوری شدت سے جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ اس ناول میں عصری تاریخ کو اس طرح موضوع بناتے ہوئے ناول میں سمویا گیا ہے کہ اسے اردو کا اہم تاریخی ناول قرار دیے جانے میں بھی کوئی

مضائقہ نہیں ہے۔ ناول گراں کے کردار تاریخ کے حقیقی کردار نہیں ہیں۔ اگرچہ تاریخی واقعات حقیقی ہیں لیکن ان واقعات کو بیان کرنے اور سامنے لانے کے لیے طاہرہ اقبال نے جو کردار تخلیق کیے ہیں وہ اسی سماج سے تعلق رکھنے کے باوجود حقیقی تاریخی کردار نہیں ہیں جب کہ ناول نیلی بار میں انھوں نے نہ عصری تاریخ کو نہ صرف حقیقی کرداروں کے ذریعے بیان کیا ہے بلکہ ان کرداروں کے نام بھی وہی ہیں جو ان کے حقیقی نام ہیں اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہو کر رہ گئے ہیں۔ جنرل ایوب خان، ذوالفقار علی بھٹو، ضیاء الحق، بے نظیر بھٹو، نواز شریف، جنرل پرویز مشرف اور سیاسی تاریخ کے دیگر کئی ایسے کردار ہیں جو اس ناول میں انھی حقیقی ناموں سے محفوظ ہو کر رہ گئے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے اس ناول میں نہ صرف سیاسی تاریخ کے ان کرداروں کا تذکرہ حقیقی انداز میں کیا ہے بلکہ ان کرداروں کے ساتھ عوام کی وابستگی کی نوعیت کو بھی واضح کیا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس ناول میں عصری تاریخ ایک مربوط انداز میں تاریخی ارتقا کے ساتھ آگے بڑھتی دکھائی دیتی ہے۔

ناول نیلی بار ناول گراں کے مقابلے میں تاریخی حوالے سے اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ اس ناول میں عصری تاریخ بیان کرتے ہوئے طاہرہ اقبال نے صرف سیاسی تاریخ کو ہی موضوع نہیں بنایا اور ایک خطے "نیلی بار" سے ناول کو جوڑنے کے باوجود تاریخ کو عالمی سطح تک لے جانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ جس عہد کی کہانی اس ناول میں بیان کی گئی ہے کہ اس عہد میں عالمی سطح پر ہونے والے اہم واقعات اور ان کے سماجی اثرات بھی اس ناول کا موضوع بنے ہیں۔ پاکستان میں ٹوٹی بنتی اسمبلیاں، مارشل لا کے دور، سماج جبر، حکومتی جبر اور مارشل لا کے دور میں عوام پر کی جانے والی سختیاں سب کچھ اس ناول میں عصری تاریخ کا حصہ بنتے ہوئے محفوظ کیے گئے ہیں۔ یوں مجموعی طور پر طاہر اقبال کا یہ ناول عصری تاریخ کی اہم دستاویز قرار پاتا ہے۔

ناول گراں اور نیلی بار میں سماجی عناصر کا تقابلی جائزہ:

ناول سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ سماج کی عکاسی، سماجی اقدار کے عروج وزوال کی داستان، سماجی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں اور ان کے سماج پر پڑنے والے اثرات کا جس طرح بیان ایک ناول نگار کرتا ہے، ایسا کسی اور صنف کے تخلیق کار کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ایک ناول نگار سماج کا حصہ ہونے اور سماج کا گہرا مشاہدہ کرنے کی وجہ سے بعض اوقات اپنے حقیقی تجربات کو بھی ناول کا حصہ بناتا چلا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر ایسے ناول نگاروں کے ہاں ملتا ہے جو معاصر تاریخی اور سماجی منظر نامے کو ناول کا حصہ بنا رہے ہوتے ہیں۔

اردو میں سماجی عکاسی اور سماج کی پیش کش کے حوالے سے لکھے گئے ناولوں کی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ یوں تو کسی بھی موضوع پر لکھا گیا کوئی ناول ہو، اس میں سماجی عکاسی لازمی ہوتی ہے۔ کوئی ناول نگار ایسا نہیں ہے جو سماج سے کنارہ کش ہو کر یا سماج کو نظر انداز کر کے ناول تخلیق کر سکے، لیکن بعض ناول نگار ایسے بھی سامنے آئے ہیں جن کے ہاں ہمیں ناولوں میں عصری تاریخ اور سماجی پیش کش بڑے توانا انداز میں ملتی ہے۔ طاہرہ اقبال کا شمار بھی ایسے ناول نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ناولوں میں سماج کی بہترین تصویر کشی کی ہے۔ طاہرہ اقبال کے دونوں ناولوں گراں اور نیلی بار میں سماجی پیش کش کا جو انداز ملتا ہے، دونوں ناولوں کے تقابلی تناظر میں اس کا جائزہ لیا جائے تو ان دونوں ناولوں میں سماج کی تصویر کے متنوع رنگ سامنے آتے ہیں۔

سماج کا خطے اور علاقے کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ایک خطے کی سماجی اقدار دوسرے خطے سے کئی حوالوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک خطے میں بسنے والی مختلف اقوام کی سماجی اقدار میں بھی دوسری اقوام کی نسبت کسی نہ کسی حد تک فرق پایا جاتا ہے۔ یہی یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کے بیشتر ناولوں میں سماج کی پیش کش کے جو متنوع زاویے اور سماجی اقدار کا جو منفرد منظر نامہ دکھائی دیتا ہے اس کے پس منظر خطے اور قوم کی انفرادیت اہم عنصر کے طور پر موجود دکھائی دیتی ہے۔ ایک تخلیق کار جب ایک سے زیادہ ناول لکھتا ہے تو وہ اپنے ناولوں میں ایک سے زیادہ خطوں اور علاقوں کو موضوع بناتا ہے۔ ان مختلف خطوں کی سماجی اقدار کی انفرادیت اس کے مختلف ناولوں کی انفرادیت بن کر سامنے آتی ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تخلیق کار کے مختلف ناولوں میں سماجی اقدار کا منظر نامہ مختلف ہونے کے باوجود ہمیں سماج سے ہم آہنگ دکھائی دیتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کسی تخلیق کار کے ایک سے زیادہ ناولوں کا سماجی تقابل کرتے ہوئے کم تر اور برتر کے تصور کو واضح کرنے کی بجائے محقق اور نقاد کو اپنی توجہ اس امر پر مرکوز رکھنی چاہیے کہ تخلیق کار نے جس خطے کو موضوع بنایا ہے، اس خطے کی سماجی اقدار کو بیان کرنے اور سامنے لانے میں وہ کس حد تک کامیاب رہا ہے۔ کیا اس نے سماج کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے مجموعی منظر نامے کو بیان کر دیا ہے یا سماج کی تہ میں اتر کر سماج کی جڑوں تک رسائی حاصل کرنے اور قاری کو سماجی اسرار سے آگاہی دلانے میں کامیاب رہا ہے۔ اس زاویے پر تحقیق و تنقید کو آگے بڑھاتے ہوئے بہتر نتائج سامنے لائے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک ناول نگار کا کون سا ناول ایسا ہے جو سماجی اقدار کو مربوط انداز میں سامنے لاتا ہے، اور ایک سماج میں بسنے والے زیادہ سے زیادہ قبائل اور طبقات کی سماجی اقدار تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

طاہرہ اقبال کے ناول گراں اور نیلی بار کا سماجی تقابل بھی ہم انھی خطوط پر کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ طاہرہ اقبال نے ان دونوں ناولوں میں دو مختلف خطوں کو موضوع بنایا ہے۔ جغرافیائی تغیر کی وجہ سے سماجی تغیرات بھی سامنے آتے ہیں۔ گراں میں پوٹھوار کے خطے کی کہانی سامنے آتی ہے تو نیلی بار اسی ناول سے موسوم خطے نیلی بار میں بسنے والے لوگوں کے سماجی حالات کو عصری تاریخ کے تناظر میں سامنے لاتا ہے۔ دونوں خطوں کی جغرافیائی صورت حال پائی جانے والی تبدیلی ان دونوں ناولوں میں سماجی پیش کش میں بھی موضوعاتی سطح پر افتراکات پیش کرتی ہے۔

ناول گراں اور نیلی بار کے سماجی تقابل میں سب سے پہلے ہم ان دونوں ناولوں کی کہانی کے زمان اور مکان کو دیکھتے ہیں۔ زمان و مکان کسی بھی ناول کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہر کہانی ایک خاص زمان و مکان کی پیداوار ہوتی ہے، اسے سمجھنے کے لیے بھی اسی زمان و مکان کی تفہیم بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر کوئی محقق یا نقاد زمان و مکان کو نظر انداز کر کے ناول کی تفہیم کی کوشش کرتا ہے تو وہ درست نتائج سامنے لانے سے قاصر رہے گا۔ زمان مکان کی اہمیت سماجی جائزے میں اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہر خطے اور ہر عہد کی اپنی سماجی اقدار ہوتی ہیں جن کی تفہیم کے لیے ناول میں زمان و مکان کے تصور کو سامنے رکھتے ہوئے تفہیمی عمل کی طرف بڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے، تب ہی ایک سماج کا دوسرے کے ساتھ تقابل کیا جا سکتا ہے اور اسی صورت میں ہی درست نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

ناول گراں جس خطے کی کہانی بیان کرتا ہے وہ خطے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں اپنی سماجی اور تہذیبی اقدار کے حوالے سے انفرادیت کا حامل ہے۔ پوٹھوار کا خطہ اپنے مخصوص جغرافیائی، تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی وجہ سے اپنی خاص انفرادیت رکھتا ہے۔ اس خطے کو کئی ناول نگاروں نے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ طاہرہ اقبال کا ناول گراں اس خطے کی تہذیبی اور سماجی اقدار کے گرد گھومتا ہے۔ انھوں نے قیام پاکستان سے قبل کے عہد سے خطے میں بسنے والے لوگوں کے سماجی اور تہذیبی حالات کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ پاکستان بننے کے بعد کے کئی سالوں کی سماجی صورت حال کو بھی اس ناول میں بیان کیا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ناول ایک خاص تہذیبی اور سماجی منظر نامے کے حامل خطے سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ زمانی اعتبار سے بھی اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جو ہندوستانی تاریخ کا اہم عہد ہے۔ اس عہد میں ہندوستان کی تقسیم اور اس کے سماجی اثرات سے سماجی سطح پر جو تبدیلیاں پیدا کیں، وہ اس ناول میں بڑی مہارت سے بیان کی گئی ہیں۔

ناول گراں اور نیلی بار میں سماج کے منظر نامے کا زمانی جائزہ لیا جائے تو یہاں بھی تاریخی تناظر کی طرف بڑا سماجی فرق زمان کا ہی دکھائی دیتا ہے۔ ناول گراں میں جس سماجی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ

ہندوستان کو مسلم ہندو مشترک سماج ہے جس کی اپنی سماجی روایات اور سماجی اقدار تھیں۔ اگرچہ مذہب سماجی اقدار کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے لیکن طاہرہ اقبال نے ناول گراں میں سماجی اقدار کا تذکرہ کرتے ہوئے مذہب سے زیادہ توجہ اس امر پر رکھی ہے کہ ہندوستان کے اس مشترکہ سماج کو سامنے لایا جائے تو تقسیم سے قبل ہندوستان کا طرہ امتیاز تھا۔ اس وقت ہندوستان پر انگریز کی حکمرانی تھی۔ طاہرہ اقبال نے بڑی مہارت سے سماجی حوالے سے اس حقیقت سے روشناس کرایا ہے کہ اگرچہ انگریزی عملداری سے ہندوستان کے لوگوں کے بہت سے حقوق پامال بھی ہو رہے تھے تاہم اس مشترکہ سماج میں انگریزی پالیسیوں اور ان کے سماجی اثرات کی وجہ سے انگریز کے بارے میں نرم گوشہ بھی پایا جاتا تھا۔ طاہرہ اقبال نے اس ناول میں میں ہندوستان کے اس مشترکہ سماج کی تصویر کشی بڑی مہارت سے کی ہے۔ دکانداروں اور تاجروں کا مذہبی فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے، سماج کے تمام افراد کو محض سماجی برادری سمجھتے ہوئے، ہر ایک سے ایک طرح کا برتاؤ کرنا سماجی اقدار کے عروج کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہندوستان کی تقسیم سے قبل کے مشترکہ سماجی نظام اور سماجی عناصر کی ایک دوسرے کے لیے پائی جانے والی محبت کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

> ادھر موہڑے، گوڑھے، تھلے، بگے، کرپال، پرتھے، ساگری، روات سکھوں کی دکانیں تھیں۔ چھنی عالم شیر میں خزاں سنگھ کی ہٹی سے بہت بڑی دکان تھی۔ یاد ہے محمد جان، ہم چھوٹی چھوٹی تھیں۔ پھوپھیوں، چاچیوں کے ساتھ باوا خزان سنگھ کی ہٹی میں جانا، ایسا بھاگوان کبھی خالی ہاتھ واپس نہ آنے دیا۔ جھولی بتاشوں یا مونگ پھلی سے بھرنی اور چینی چولے جو گاچولے کا ٹوٹا دے کر ٹورنا۔[۴]

طاہرہ اقبال نے گراں میں ہندوستان کی تقسیم سے قبل کے سماجی حالات کو ناسٹلجیا کی صورت میں بیان کیا ہے۔ اس ناول کے وہ کردار جنھوں نے مشترکہ سماج میں زندگی گزاری تھی، وہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہجرت کر کے جب پاکستان مین بس گئے تو لازمی طور پر وہ فکری سطح پر خاصے متاثر ہوئے۔ انھیں اپنی زمینوں، جائدادوں اور مال واسباب سے زیادہ اس مشترکہ سماج کی یاد ستاتی تھی، جس کی سماجی اقدار کے وہ رسیا ہو چکے تھے۔ یہ ناسٹلجیائی کیفیت تقسیم کے موضوع پر لکھے جانے والے اکثر ناولوں میں دکھائی دیتی ہے۔ زمانی اعتبار سے طاہرہ اقبال کا ناول گراں، ناول نیلی بار پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے ہندوستان کے مسلم ہندو مشترکہ سماج کا نقشہ کھینچنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان پر انگریز کی عملداری اور انگریز کے طرزِ حکومت کے سماجی پہلو کو بھی نمایاں کیا ہے جب کہ ناول نیلی بار نوآبادیاتی عہد کے سماجی منظر کو بیان کرنے کی بجائے ہندوستان کی تقسیم کے بعد کے پاکستان کے سماجی منظر نامے کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول گراں

میں انگریزی طرزِ حکمرانی کے خاص وصف ذات پات کے نظام کی تقویت اور سماج کو طبقات میں تقسیم کرنے کا رجحان زیادہ توانا دکھائی دیتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس ناول میں نوآبادیاتی عہد کے سماج کے اس زاویے کو بھی نمایاں کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> خاندانوں کی عزت تھی۔ کمی کمین چوراچکوں کو جرأت نہ تھی۔ فوج میں بڑی ذاتوں کے لوگ بھرتی ہوتے۔ انگریز سرکار اپنے درباروں میں خاندانی لوگوں کو کرسی پیش کرتے۔ آج ہر کمی کمین ذات بدل کر شہروں میں جاکر عزت دار بن بیٹھا ہے۔ ہائے انگریزی بڑی سیانی قوم، ہائے ایسی ست بھائیاں کسی چیز کی کمتی نہ ہوتی۔ زنانیاں سونے سے لدی رہتیں۔ انبار انداج سے خالی نہ ہوتے۔ مارشل ذاتوں کو عزت ملتی، سید، اعوان، راجپوت، پٹھان، پانچویں کسی ذات کو تو وہ منہ نہ لگاتے۔[5]

طاہرہ اقبال کا ناول گراں زمانی اعتبار سے جس طرح تقسیم سے قبل کے ہندوستان کے مشترکہ سماج کا نقشہ کھینچا ہے، ناول نیلی بار میں ایسا نہیں ہے۔ اگرچہ ناول نیلی بار میں بھی انھوں نے قدیم سماجی روایات اور سماجی اقدار کی نشاندہی کی ہے اور سماج کے مختلف عناصر کی تصویر کشی کی ہے، لیکن اس ناول تقسیم سے قبل کا مشترکہ سماجی منظر نامہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے علاوہ ناول گراں میں انگریز طرزِ حکومت کے سماجی اثرات اور سماجی طبقات کا جو نظام سامنے آتا ہے، ناول نیلی بار اس سے بھی تہی دست دکھائی دیتا ہے۔

ناول نیلی بار میں مقامی تہذیب وثقافت کی جھلکیاں اور سماج میں مقاومیت کا عنصر زیادہ شدت سے سامنے آتا ہے۔ گراں کے کردار تو ناسٹلجیائی کیفیات کے زیر اثر ہمیں ہندوستان کے مشترکہ سماجی منظر کی جھلک دکھاتے ہیں لیکن ناول نیلی بار کے کردار مقاومیت کے زیر اثر سماجی اقدار سامنے لاتے ہیں۔ یہ ایسی اقدار ہیں جو نیلی بار کے سماج میں آج بھی کسی نہ کسی صورت میں رائج ہیں۔ طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں ان اقدار کی عکاسی کے لیے انداز بیان بھی ایسا تشکیل دیا ہے جو مقاومیت کا عنصر لیے ہوئے۔ قاری پڑھتے ہوئے یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ کہانی اور سماجی منظر نامہ ماضی کا نہیں بلکہ حال کو ہی بیان کیا جارہا ہے۔ یوں گراں کی طرح ناسٹلجیائی کیفیات کی بجائے مقاومیت کا عنصر اس ناول میں زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ ایک شادی کے موقع پر مقامی سماجی روایات کی جھلک ملاحظہ ہو:

> گاؤں کی عورتیں میلوں پیدل چلتی بستی سے دور تک بارات کو رخصت کرنے آئیں اور جدائی کے گیتوں اور آنسوؤں میں لپٹی دن چڑھے واپس لوٹیں۔ رنگلے کجاووں

پر سوار لڑکیوں میں وہ بھی تھیں جنھیں بار کا گہنا کہا جاتا تھا۔ راوی کا سنگھار بولا جاتا تھا۔ جیسے ست بھرائی ، ٹھراں، لکھاں، بختاں دونوں ابروؤں کے بیچ لال اور نیلے رنگ سے کھدا ہوا چاند ستارہ، ٹھوڑی کی نوک پر ہرے اور لال رنگ میں کندہ پھول پتیاں ہڑپہ کے کھنڈرات میں سے نکلنے والی ہندو دیویاں، گھڑی گھڑائی سنگ مرمر کی مورتیاں، کچی عمر کی نخریلی مٹیاریں، یہی تو چند بہاریہ دن ہیں جب پوران باران قدموں کی لتاڑ تلے ہے۔[6]

گراں اور نیلی بار کے متن سے ہم نے جو مثالیں پیش کی ہیں ان سے فرق واضح ہو رہا ہے کہ گراں میں ہندوستان کا مشترکہ سماجی منظر نامہ سماجی پیش کش کی بنیاد بنتا دکھائی دیتا ہے تو نیلی بار میں مشترکہ سماجی منظر نامے کی بجائے تقسیم کے بعد ایک مخصوص خطے "نیلی بار" جسے باران بھی کہا جاتا ہے، اس کی سماجی اقدار کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یوں سماجی حوالے سے مکان کے تناظر میں دیکھا جائے تو گراں کا سماجی منظر نامہ زیادہ وسعت کا حامل معلوم ہوتا ہے۔

سماج تغیر پذیر ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سماج میں تبدیلیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں ہی سماجی ارتقا کی ضمانت ہوتی ہیں۔ ایسے سماج جو تغیر کے عمل سے نہیں گزرتے ان میں جمود پیدا ہو جانے کی وجہ سے ان کی سماجی اقدار میں وسعت نہیں آپاتی۔ آج بھی دنیا کے چند ایسے خطوں کو دیکھیں جہاں کے لوگ جدید طرزِ زندگی سے غافل ہیں، ان کے ہاں ہمیں سماجی اقدار کا چلن وہی نظر آتا ہے، جو ان کی کئی نسلوں میں پہلے سے موجود تھا۔ جب کہ ایسے سماج جو وقت کے دھارے میں بدلتے چلے گئے، سماجی اور معاشی حالات نے ان کو بدلنے پر مجبور کر دیا، اگرچہ پہلے سے قائم سماجی اقدار کسی قدر متاثر تو ہوئیں تاہم بدلتے ہوئے معاشی منظر نامے نے ان قدیم سماجی اقدار کی جگہ نئی اقدار رائج کر دیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نئی رائج ہونے والی سماجی اقدار کی بنیاد اقدار اور روایات سے زیادہ دولت پر قائم ہو رہی ہیں۔ یہ سلسلہ اس مادیت پرستی کے دور میں بڑی شدت سے جاری ہے۔ طاہرہ اقبال کے ناول گراں میں ہمیں یہ وصف دکھائی دیتا ہے کہ انھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ زمانے میں آنے والے بدلاؤ کو پیش نظر رکھتے ہوئے، سماجی اقدار میں آنے والے تغیر کو بھی سامنے لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہاں ان کا انداز بیان ایسا ہے کہ وہ معاشی صورت حال کو سماجی منظر نامے اور خاص طور پر سماجی اقدار میں تغیر کی وجہ قرار دیتی ہیں۔ ناول گراں سے ایک جھلک ملاحظہ ہو:

بے بسی گالیوں، بددعاؤں کی صورت میں بہہ نکلی، مہندی کے گھلے ہوئے تھال پڑے رہ گئے۔ مہندی چوڑیوں سے سجے چنگیر، پھول جھنڈیاں، گوٹے کناریاں لڈو

مٹھائیوں کے ٹوکرے خود کھانے کو دوڑنے لگے۔اب گڑ بتاشے بانٹنے اور مائیاں بنانے کا رواج ختم ہو رہا تھا۔ کبھی مائیوں کی رسم کے لیے کئی روز یہ مائیاں یعنی میٹھی ٹکیاں بٹتی تھیں۔ پورے گراں کی عورتیں اکٹھی ہوتیں کوئی گڑ کا شربت بناتی، کوئی اس شربت سے سخت سا آٹا گوندھتی، کوئی بیلنے پر ٹکیاں گھڑتی۔ کچھ ان ٹکیوں کو کڑکتے ہوئے دیسی گھی میں تلتیں۔ جو مایوں کی رسم میں عورتوں میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ لیکن اب یہ سب قدیمی رسمیں ولایت کی دولت نے ہڑپ کر لی تھیں۔اور آج ولایت سے آئی دولت کے یہ سبھی امیرانہ اظہاریے اجڑی ہوئی اس محفل کا جیسے منہ چڑھاتے تھے۔[۷]

بدلتا ہوا یہ سماجی منظر نامہ ہمیں جس شدت سے گراں میں دکھائی دیتا ہے، ایسی شدت ناول نیلی بار میں سامنے نہیں آتی۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ناول نیلی بار میں ماضی سے زیادہ توجہ عصری تاریخ پر مرکوز رہی ہے۔ ناول نگار نے عصری تاریخ کو بیان کرتے ہوئے زیادہ تر سیاسی اور حکومتی عناصر کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اور اس ناول میں سماجی منظر نامے کے حوالے سے بھی انھی عناصر کے اثرات زیادہ شدت سے سامنے آتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ناول گراں کا موضوع بننے والے پوٹھوار کا خطہ ایسا ہے جس سے ۱۹۷۰ء کے بعد کثیر تعداد میں لوگوں نے ترک سکونت کر کے یورپی ممالک اور برطانیہ میں ڈیرے ڈالے۔ وہاں سے آنے والے پیسے نے اس خطے کی معاشی حالت کو سدھارنے کے ساتھ ساتھ اس خطے میں بسنے والے لوگوں کے طرزِ زیست کو بھی بدل دیا۔ جب کہ ناول نیلی بار میں ایسی صورت حال دکھائی نہیں دیتی۔ یہ ناول سماجی حوالے سے تقسیم ہند کے واقعات اور ان کے سماجی اثرات کو موضوع بناتا ہے تو پھر بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے پاکستانی سیاسی منظر نامے تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔

ناول گراں اور نیلی بار میں سماجی سطح پر ہونے والے تغیرات کا اہم نکتہ یہ ہے کہ گراں کا سماجی منظر نامہ معاشی حالات کے تحت بدلتا دکھائی دیتا ہے جب کہ نیلی بار کا سماجی منظر نامہ بدلنے میں سیاسی اور حکومتی عناصر کا عمل دخل خاصا زیادہ ہے۔ خاص طور پر مارشل لا کے دور میں سماجی جبر اور حکومتی جبر سے سماج میں جو تغیر پیدا ہوا، وہ اس ناول میں بڑی شدت سے سامنے آتا ہے۔ گراں میں سماجی کے جبر کا ایسا منظر نامہ دکھائی نہیں دیتا۔

ناول گراں اور نیلی بار میں سماجی حوالے سے ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ ناول گراں میں غالب سماج گاؤں کا سماج ہے۔ گاؤں کی سماجی اقدار، گاؤں میں تغیر کے عناصر اور ان کے زیر اثر سماج میں آنے

والا بدلاؤ اس ناول کا اہم موضوع بنے ہیں جب کہ ناول نیلی بار میں اگرچہ ابتدائی ابواب گاؤں کی زندگی کے گرد گھومتے ہیں تاہم آگے چل کر ناول میں کسی نہ کسی حد شہری سماج کی جھلکیاں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں۔

گراں اور نیلی بار کے ان سماجی افتراکات کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے عناصر بھی ہیں جو سماجی حوالے سے دونوں ناولوں میں کسی حد تک اشتراکات بھی پیدا کرتے ہیں۔ ان میں اہم عمل سماج کے عام اور خاص طور پر نچلے اور متوسط طبقے کی سماجی اقدار اور سماجی روایات ہیں۔ شادی بیاہ اور فصلوں کی کٹائی کے وقت سامنے آنے والی سماجی اقدار کا منظر نامہ دونوں ناولوں میں کسی حد تک ملتا جلتا دکھائی دیتا ہے۔ گاؤں کی سطح پر ان سماجی اظہاریوں کے موقع پر بولے جانے والے گیت اور بولیاں دونوں ناولوں میں اپنے بھرپور تاثر کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔ دونوں ناولوں میں طاہرہ اقبال نے سماجی اقدار کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کرنے کے لیے جزئیات نگاری پر خاص توجہ دی ہے۔ خاص طور پر شادی بیاہ اور فصلوں کی کٹائی کے مواقع جو سماجی اقدار کے اہم اظہاریے ہوتے ہیں، ان مواقعوں پر سماجی اقدار کی پیش کش بڑی مہارت سے کی گئی ہے۔ بولیوں اور گیتوں کے ذریعے انھوں نے ان میں مقاومیت کا رنگ بھرا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو گراں اور نیلی بار دونوں ناول اپنے سماجی خصائص کے حوالے سے اردو کے اہم سماجی ناولوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ ان دونوں ناولوں کے زمانی اور مکانی منظر نامے کو مد نظر رکھتے ہوئے انھوں نے دونوں کی کہانیوں میں جس سماج کو پیش کیا ہے وہ پوٹھوار (گراں) اور نیلی بار (نیلی بار) کا حقیقی سماج ہے۔ طاہرہ اقبال نے بڑی مہارت سے ان دونوں سماجوں کو سماجی روایات کے ساتھ ساتھ بدلتی ہوئی سماجی اقدار کے تناظر میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ سماجی حوالے سے ان ناولوں میں جامد کی بجائے ارتقا پذیر سماج دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے ناول کی کہانی کے عہد کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے اس عہد میں سماجی سطح پر پیدا ہونے والے تغیرات کو بھی ناول کا حصہ بنایا ہے۔ یوں یہ دونوں ناولوں سماجی حوالے سے خاصے کامیاب ناول بن کر سامنے آئے ہیں۔

طاہرہ اقبال نے ان دونوں ناولوں میں سماج کا حقیقی چہرہ دکھاتے ہوئے اس حقیقت کو مد نظر رکھا ہے کہ کہیں بھی ان خطوں کی سماجی اقدار کی اصلیت کو مجروح نہ ہونے دیا جائے۔ یہ ان دونوں ناولوں کی بڑی خوبی ہے۔ سماجی اقدار کو ان کی اصل حالت میں بیان کرنے کے لیے انھیں زبان کو بھی جس طرح بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کو بھی بدلا اور لسانی منظر نامے کو اہم جانتے ہوئے سماجی حقائق کو مقامی سماجی کردار کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء)، ص ۷۲۔

۲۔ طاہرہ اقبال، گراں (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ص ۲۲۔

۳۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۶۔

۴۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۳۹۔

۵۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۴۱۔

۶۔ طاہرہ اقبال، نیلی بار، ص ۳۳۔

۷۔ طاہرہ اقبال، گراں، ص ۹۶۔

ماحصل

حاصلِ مطالعہ

(محاکمہ، نتائج، سفارشات/تجاویز)

محاکمہ

ادب سماج کا آئینہ ہے۔ سماج میں ہونے والی ہر نوع کی تبدیلیاں براہ راست یا بالواسطہ ادب کو متاثر کرتی ہیں۔ ادب کے موضوعات سماج سے ہی جنم لیتے ہیں اور سماج ہی ادب کی بقااور پرورش کا ضامن ہوتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں وہ سماج جو تغیر پذیر ہوتے ہیں اور خاص طور پر ہنگامی حالات سے گزر رہے ہوتے ہیں، ان میں ان ہنگامی عہد کے دوران میں تخلیق ہونے والے ادب کا تاثر بہت شدید ہوتا ہے۔

ادب اور سماج کے رشتے کی بات کی جائے تو یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم حیثیت اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نہ تو سماج کے بغیر ادب کی کوئی ٹھوس بنیاد ہے جس پر وہ قائم رہ سکے اور نہ ہی ادب کے بغیر سماجی اقدار کی نشو ونما اور ان سے آگاہی کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ یہ ادب ہی ہوتا ہے جو سماج میں سے موضوعات لے کر ایک طرف سماجی اقدار کی عکاسی کر رہا ہوتا ہے تو دوسری طرف مٹتی ہوئی سماجی اقدار کا نوحہ بن کر بھی سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ سماج میں پروان چڑھنے والے منفی رویوں کے خلاف ایک مضبوط آواز بھی ادب ہی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس خطے میں ہر عہد میں آنے والی تبدیلیوں نے ادب کو متاثر بھی کیا اور ادب نے ایسی تبدیلیوں کے خلاف مزاحمت کا علم بھی بلند کیا جو سماجی اقدار کے زوال کا باعث بن سکتی تھیں۔ نثر و شعر دونوں صورتوں ہمیں منفی رویوں کے خلاف مزاحمت دکھائی دیتی ہے۔

ادب کی مختلف اصناف میں سے ناول ایک ایسی صنف ادب ہے جو سماجی، تاریخی، معاشی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے سماج کی پیش کش کا اہم ذریعہ ہے۔ ان امور کو جس طرح ناول جیسی وسیع کینوس کی حامل صنف میں پیش کیا جاسکتا ہے، ایسا کسی دوسری صنف میں ممکن نہیں ہے۔ اردو ناول کی روایت کا موضوعاتی حوالے سے جائزہ لیں تو اردو ناول نے ہر دور کے سیاسی و سماجی حالات اور تہذیبی و ثقافتی منظر نامے کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں سماجی اور تاریخی پس منظر میں لکھے جانے والے ناولوں کی ایک مضبوط روایت دکھائی دیتی ہے۔ اس روایت میں بہت سے ایسے ناول نگار سامنے آئے ہیں جنھوں نے

ادب ، سماج، سیاست اور تہذیب کا رشتہ جوڑتے ہوئے اردو ناول کو فکری و موضوعاتی حوالے سے خاصی وسعت فراہم کی ہے۔اردو ناول کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب اور سماج کے رشتے کو جس طرح ناول کی صنف نے اپنے دامن میں سمو کر وسعت دی ہے ، ایسا توانا رجحان کسی اور صنف میں دکھائی نہیں دیتا۔اس کی ایک بڑی وجہ ناول کا کینوس بھی ہے۔اس صنف کے وسیع کینوس کی وجہ سے یہ کسی ایک خاص پہلو یا سماج کے کسی خاص زاویے کی بجائے مجموعی سماجی اور تاریخی منظر نامے کو سامنے لاتا ہے۔ اگرچہ ناول کسی ایک خاص موضوع پر لکھا جاتا ہے لیکن ناول نگار اس موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے سماج کے مجموعی منظر نامے کو سامنے لاتا چلا جاتا ہے۔ اس کے کردار اور زمان و مکان خاص وسعت کے حامل ہوتے ہیں۔ یہی وسعت ناول کی صنف کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنے عہد یا جس عہد کی کہانی اس میں بیان کی گئی ہوتی ہے، اس کہانی کو پورے سیاسی و سماجی منظر نامے میں چلاتا چلا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ اردو میں ایسے کامیاب ناول بھی ملتے ہیں جو ہزاروں سال کی تہذیبی اور سماجی زندگی کو بڑی کامیابی سے موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ یہ ناول نگار کی مہارت ہوتی ہے کہ وہ اپنے عہد یا تخلیق کی کہانی کے عہد کو کس تکنیک کے ذریعے اور کس انداز سے ناول کا حصہ بناتا ہے۔

ناول اور سماج کے تعلق کی جہت تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں بھی سامنے آتی ہے۔ ناول نگار اگرچہ وسیع موضوع کا احاطہ کر رہا ہوتا ہے لیکن موضوع کی وسعت بھی زمان و مکان کی قید کے اندر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ناول میں ہمیں کسی خاص خطے اور کسی خاص عہد کی کہانی ملتی ہے۔ یہ کہانی اس عہد اور اس خطے کے سماجی اور ثقافتی منظر نامے کی عکاس بن کر سامنے آتی ہے۔

ناول اور تاریخ کے تعلق کو دیکھا جائے تو ناول کا تاریخ کے ساتھ گہرا تعلق دکھائی دیتا ہے۔اردو ناول نے تاریخ کو ادب کا حصہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ناول اور تاریخ کے تعلق کو دیکھا جائے تو ناول میں ہمیں تاریخ کا رجحان دو حوالوں سے دکھائی دیتا ہے۔ پہلا زاویہ ماضی کی تاریخ ہے۔اردو میں بہت سے ناول نگار ایسے ہیں جنھوں نے اپنے عہد سے قبل کی تاریخ کو ناول کا موضوع بناتے ہوئے ایسے کامیاب ناول تحریر کیے ہیں جو تاریخی ناول کہلاتے ہیں۔ ناول اور تاریخ کے اس تعلق کی وجہ سے لکھے جانے والے ایسے ناولوں کی تعداد اور معیار اس قدر بلند ہے کہ اردو میں تاریخی ناول کی باقاعدہ روایت تشکیل پا چکی ہے۔ تاریخی حوالے سے ناول اور تاریخ کا دوسرا زاویہ معاصر تاریخ کے تناظر میں سامنے آتا ہے۔ بعض ایسے ناول نگاروں کی تخلیقات سامنے آئی ہیں جنھوں اپنے عہد کی تاریخ کو ناول کا حصہ بناتے ہوئے تاریخ اور ناول کا تعلق مضبوط کیا ہے۔ اردو

ناول کی روایت کا جائزہ لیں تو ایسے ناول نگاروں کی تعداد بھی کم نہیں ہے جنھوں نے معاصر تاریخ کو ناول کا موضوع بنایا ہے۔

اردو ناول کی روایت کا سماجی اور تاریخی تناظر میں جائزہ لیتے ہوئے جب ہم جدید عہد کے ناول نگاروں پر نظر ڈالتے ہیں تو جدید عہد میں بھی کئی ایسے ناول نگار ہیں جن کے ہاں ہمیں ناول میں سماج، تہذیب اور تاریخ کی پیش کش بڑے جاندار اور توانا انداز میں ملتی ہے۔ طاہرہ اقبال کا شمار بھی ایسے ہی ناول نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ناولوں گراں اور نیلی بار میں سماج اور تاریخ کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ ادب، سماج اور تاریخ کے تعلق کو مضبوط کرتے ہوئے ان کے یہ ناول اردو ناول نگاری کی روایت کی اہم کڑیاں شمار ہوتی ہیں۔ ان ناولوں میں طاہرہ اقبال نے پوٹھوار اور نیلی بار کے علاقے کی سماجی اقدار اور تہذیبی و ثقافتی روایات کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تقسیم سے چند سال قبل سے لے کر جدید عہد تک کے سیاسی و سماجی منظر نامے اور معاصر تاریخ کو بڑی مہارت بیان کیا ہے۔

ناول گراں طاہرہ اقبال کا ایسا ناول ہے جو ایک پوٹھوار کے خطے کی سماجی اور تاریخی صورت حال کو سامنے لاتا ہے۔ جغرافیائی تناظر میں دیکھا جائے تو پوٹھوار کا خطہ اپنا خاص تاریخی اور جغرافیائی منظر نامہ رکھتا ہے۔ اس خطے کی تہذیب صدیوں پرانی ہونے کی وجہ سے سیاحوں کے لیے باعث کشش بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ خطہ اپنے مخصوص سماجی، تہذیبی اور ثقافتی منظر نامے کی وجہ سے بھی تاریخ کے صفحات پر اپنی اہمیت منواتا نظر آتا ہے۔ یہ ایسا ناول ہے جس میں انھوں نے تاریخ کو براہ راست تو موضوع نہیں بنایا تاہم ناول کے متن میں ہمیں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جو تقسیم سے قبل کی تاریخ کو سامنے لاتے ہیں۔ تقسیم سے قبل ہندوستانی سماج میں جو مشترکہ سماجی منظر نامہ موجود تھا، اس ناول میں اس کی عکاسی مختلف کرداروں کے ذریعے کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ طاہرہ اقبال نے یہ بھی خیال رکھا ہے کہ وہ ان واقعات کو ناول کا حصہ بنائیں اور ان یادوں کو اپنی تخلیق میں سمونے کی کوشش کریں، جو اس وقت کے سماج کا حقیقی چہرہ سامنے لاتی ہیں۔ مشترکہ سماج میں جس طرح مذہب اور قوم کی تفریق کے بغیر سماجی رشتے قائم تھے، ہندو، مسلم، سکھ اور دیگر اقوام کے لوگ جس طرح ایک دوسرے سے سماجی لین دین اور سماجی تعلق میں بندھے ہوئے تھے، طاہرہ اقبال کا ناول گراں اس کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ طاہرہ اقبال نے ہندوستان کی تقسیم سے قبل کی تاریخ کو ناول کا حصہ بناتے ہوئے اس امر کا خاص خیال رکھا ہے کہ، ان کی تخلیق ناول ہے اور ناول ہی رہے۔ کہیں بھی وہ تاریخی بیان کو ادبیت کے دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول پڑھتے ہوئے قاری تاریخ سے آشنائی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی سے بھی لطف اندوز ہوتا چلا

جاتا ہے۔ یہ ایک بڑے ادیب کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ سماج اور تاریخ کے کسی بھی زاویے کو موضوع بنا رہا، ہر جگہ وہ مؤرخ کی بجائے ایک ادیب اور ناول نگار کے طور پر ہی سامنے آتا ہے۔ اس کی تحریر تاریخ کی عکاسی کرنے کے باجود ادبیت کے معیار سے گرنے نہیں پاتی۔ طاہرہ اقبال کی ناول نگاری کی نثر میں یہ خصوصیت دکھائی دیتی ہے کہ ان کے ہاں تاریخ کے اہم بیان کے باوجود ادبیت متاثر نہیں ہونے پاتی۔ ناول ہر صورت میں ناول ہی رہتا ہے۔

گراں میں تاریخی اعتبار سے جس عہد کو موضوع بنایا گیا ہے وہ عہد قیام پاکستان سے چند سال قبل سے شروع ہو کر بیسویں صدی کے آخر تک آتا ہے۔ یہ ایسا عہد ہے جو برصغیر کی تاریخ کا ہنگامہ خیز عہد ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کے جن سالوں کا تذکرہ اس ناول میں ملتا ہے ان کے بھی دو زاویے سامنے آتے ہیں۔ ایک تو مشترکہ سماجی منظر نامہ ہے جو مختلف کرداروں کی بول چال میں ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ کردار ناسٹلجیائی عناصر کے زیر اثر اس مشترکہ سماج میں گزرے ہوئے اپنے زندگی کے مہ وسال کو یاد کرتے ہیں اور آزادی حاصل ہو جانے کے باوجود وہ اس مشترکہ سماج کے سحر سے باہر نہیں نکل پاتے۔ اس سے ایک اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ انسان جس سماج میں پل بڑھ کر جوان ہوا ہوتا ہے۔ جس سماج میں اس کا زندگی کا ابتدائی حصہ گزرا ہوتا ہے، وہ سماج اس کے شعور کا حصہ بن جاتا ہے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اس کے سحر سے خود کو آزاد نہیں کروا پاتا۔ سماجی حوالے سے طاہرہ اقبال نے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے ان کے اپنے مشترکہ سماج کی یاد دل میں بسانے کو سامنے لا کر کرداروں کے نہ صرف خارج کو بیان کیا ہے بلکہ ناسٹلجیا کے ذریعے وہ کرداروں کے دل و دماغ اور باطنی کیفیات تک رسائی حاصل کرنے اور انھیں ناول کا حصہ بنانے میں کامیاب رہی ہیں۔ گراں کے مطالعے سے یہ حقیقت ہم پر آشکار ہوئی ہے کہ ہندوستان کے مشترکہ سماجی منظر نامے میں پلنے والی نسلیں اس سماج کی یادوں کے سحر سے باہر نہیں نکل پائیں۔ اس میں طبقاتی تفریق بھی بہت کم آڑے آئی ہے۔ ہر طبقہ کے لوگوں کے ہاں ہمیں یہ ناسٹلجیائی رجحان دکھائی دیتا ہے۔ اس رجحان کی بڑی وجوہات بھی دو ہیں۔ ایک تو ان لوگوں کا اس ماحول میں زندگی گزارنا اور مختلف مذاہب اور مختلف اقوام کے لوگوں کی سماجی اقدار میں حصہ دار بننا۔ دوسرا نو آبادیاتی عہد میں امن وامان کی صورت حال کا بہتر ہونا۔ ناول گراں تقسیم سے قبل کے سماجی منظر نامے کو بیان کرتے ہوئے ان دونوں وجوہات کو بڑی مہارت سے ادبی شان کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔ اس ناول کی خواتین کردار آپس کی گفتگو میں انگریزی امن وامان کی صورت حال کو بھی یوں موضوع بناتی ہیں گویا اس کے چھن جانے کا غم بہت زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب و قوم کی تفریق سے بالاتر ہو کر سماجی تعلقات کی مضبوطی بھی ان کے ہاں اظہار پاتی دکھائی دیتی ہے۔

تقسیم ہند کا واقعہ بر صغیر کی تاریخ کا ایسا واقعہ ہے جس نے ہندوستان کے ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا۔ ایک طرف صدیوں سے بنا ہوا سماجی منظر نامہ اکھڑ گیا تو دوسری طرف محبت، سماجی رواداری اور سماجی اقدار کے زوال کے بعد عداوت، خود غرضی اور لوٹ کھسوٹ سماج میں رواج پانے لگی تو ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا تھا؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ بے بسی اور بے چارگی کی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ گویا آزادی کے خواب دیکھنے والی قوم اس آزادی کی بہت بڑی قیمت چکانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اس صورت حال نے سماج کے دیگر طبقات کے ساتھ ساتھ شعر و ادب سے تعلق رکھنے والوں کو بھی متاثر کیا۔ ادب نے اس طرزِ عمل کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ جس سحر کی امید تھی، جس سحر کے لیے جانیں قربان کی گئیں یہ وہ سحر نہیں ہے۔ اس عہد میں ادب میں فسادات اور ان فسادات کے سماجی اثرات اہم موضوع بن کر ابھرے۔ طاہرہ اقبال کا ناول "گراں" تقسیم سے قبل کی صورت حال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ہجرت کے موقع پر ہونے والے فسادات کو بھی خاص طور پر موضوع بناتا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جو ان کے دونوں ناولوں میں ملتا ہے۔ طاہرہ اقبال کے ناول گراں اور نیلی بار اگرچہ دو مختلف خطوں کی کہانیوں سے تعلق رکھتے ہیں تاہم ان دونوں ناولوں میں ہجرت کے موقع پر ہونے والے فسادات کو موضوع بنا کر انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ تقسیم کے موقع کی عکاسی کرتا کوئی بھی ادب ہجرت اور فسادات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اپنے ناولوں فسادات کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ انداز حقیقی ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر لکھے جانے والے بیشتر ناولوں میں ناول نگاروں نے جذبات سے بہت زیادہ کام لیا ہے اور جذبات کے ذریعے سنسنی بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، تاہم طاہرہ اقبال کے ناولوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ جذبات کے سے زیادہ حقیقت سے کام لینے کی عادی ہیں۔ ان کے ہاں حقیقت کا جذبے کی زیریں لطیف رو کے ساتھ بیان ملتا ہے۔ ان کی تحریر میں جذباتیت اس حد تک ہی پائی جاتی ہے، جو ایسے واقعات کو سننے، پڑھنے اور دیکھنے والوں کے ہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ امر ان کو حقیقت نگار ناول نگار کے طور پر سامنے لاتا ہے۔

ناول گراں میں پاکستانی سماج کے کے اتار چڑھاؤ کا بیان بھی ملتا ہے۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد تک کو فسادات کا اثر غالب رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب سماجی باشندے اس اثر سے نکلنے لگے تو اپنی زندگیوں اور اپنے مستقبل کو سدھارنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ بہتر مستقبل کی خاطر دیگر کوششوں کے ساتھ ساتھ بیرون ملک ترک سکونت کرنے کا رجحان بھی سامنے آیا۔ یہ رجحان جن خطوں میں زیادہ دیکھنے کو ملا ان میں پوٹھوار کا خطہ بھی اہمیت کا حامل ہے۔ طاہرہ اقبال کے ناول گراں میں بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں

پوٹھوار کے خطے کے لوگوں کا ترک سکونت کا رجحان بڑی شدت سے دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے ایک طرف اس رجحان کی عکاسی کی ہے تو دوسری طرف ترک سکونت کرنے والوں کے مسائل اور ان کے اس عمل کے سماجی اثرات کو بھی کسی حد تک پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں یہ ناول گراں سماج کے اس اہم بدلتے ہوئے معاشی رجحان کو بھی سامنے لاتا ہے۔ اس کے علاوہ ناول گراں میں پوٹھوار کے خطے کی سماجی روایات، تہذیبی اقدار اور معاشی منظر نامے کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طاہرہ اقبال نے اس خطے کے لوگوں کے طرزِ معاشرت اور معیشت کا بڑی باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہوئے اپنے مشاہدات کو ناول کے قالب میں ڈھالا ہے۔

طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار اردو کے ان نمائندہ ناولوں میں شمار ہوتا ہے، جو عصری تاریخ اور جدید عہد کے سماجی حالات کو بیان کرنے کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ نیلی بار جس خطے کی کہانی بیان کرتا ہے وہ خطہ بھی اپنے جغرافیائی اور سماجی حالات کی وجہ سے اہم ہے۔ اس کے علاوہ جس عہد کو اس ناول میں موضوع بنایا گیا ہے، وہ عہد قیام پاکستان سے لے کر جنرل مشرف کے دورِ حکومت تک آتا ہے۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ کی زمانی وسعت اس ناول کو تاریخی اور سماجی حوالے سے کئی جہات کی طرف بڑھتا دکھاتی ہے۔ ایک طرف اس ناول میں پاکستانی سیاست اور اقتدار کی رسہ کشی کی داستان ملتی ہے تو دوسری طرف مختلف سیاسی واقعات کے سماج پر پڑنے والے اثرات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ اس ناول میں عصری تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو فسادات کے واقعات کے بعد یہ ناول بڑی تیزی کے ساتھ تاریخ کے اس دور میں داخل ہوتا ہے، جب جنرل ایوب نے ملک میں مارشل لا نافذ کیا تھا۔ جنرل ایوب نے اگرچہ جمہوریت کی بساط لپیٹی تھی، تاہم عوامی فلاح کے لیے کی جانے والی اصلاحات نے انھیں عوامی پذیرائی بھی عطا کی تھی۔ نیلی بار جنرل ایوب کے عہد میں نافذ ہونے والے جبر اور اس جبر کے سماجی اثرات کے ساتھ ساتھ عوامی فلاح کے لیے کی جانے والی اصلاحات کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اس ناول میں کسانوں کی فلاح کے لیے پیش کیے جانے والے منصوبے، صنعت کاری کا فروغ اور دیگر کئی ایسے سماجی امور موضوع بحث بنے ہیں جو جنرل ایوب کے مرہون منت ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنرل ایوب کے عروج کے زوال میں بدلنے اور پھر "ایوب کتا ہائے ہائے" کے نعرے لگنے تک سب کچھ اس ناول میں بیان کیا گیا ہے۔ طاہرہ اقبال نے عصری تاریخ کو ایک تسلسل اور روانی کے ساتھ یوں بیان کیا ہے کہ، ناول کی ادبیت کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے ایوب سے ہونے والی غلطیوں اور ان غلطیوں کے سماجی اثرات بھی نمایاں کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول اس عہد کی عصری تاریخ کا اہم منبع قرار پاتا ہے۔

جنرل ایوب کے دور کی عصری تاریخ کے بعد یہ ناول دیگر سیاسی واقعات کو موضوع بناتا ہوا سقوط ڈھاکہ کی طرف بڑھتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ پاکستان کی تاریخ کا ایسا واقعہ ہے جس نے پاکستان کو دولخت کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستانی سماج میں بھی گہری خلیج پیدا کر دی۔ اس کے علاوہ شکست کا جو داغ لگا، اس نے افرادِ معاشرہ کو نفسیاتی طور پر خاصا متاثر کیا۔ طاہرہ اقبال نے نیلی بار میں سقوطِ ڈھاکہ کے سماجی اثرات اور اس کے بارے میں پائے جانے والے سماجی رد عمل کو نمایاں کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اس ناول میں ملکی سیاست میں ذوالفقار علی بھٹو کے عروج کے طرف بڑھنے اور انھیں حاصل ہونے والی عوامی پذیرائی کو موضوع بنایا ہے۔ بھٹو نے عوام کی فلاح کا جو نعرہ لگایا تھا اگرچہ اس پر مکمل طور پر عمل نہ کیا جا سکا تاہم بھٹو کے بعض کام ایسے بھی تھے، جن سے عوام کو اپنی فلاح نظر آنے لگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بھٹو کو بہت کم وقت میں عوامی مقبولیت نصیب ہو گئی تھی۔ طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار بھٹو کی عوامی مقبولیت کے ساتھ ساتھ وہ طبقات جن میں بھٹو کے خلاف عناد یا عداوت پائی جاتی تھی، ان کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ ہمیں اس ناول میں کئی جگہوں پر بھٹو اور اس کے حواریوں کے خلاف مکالمے بھی ملتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طاہرہ اقبال نے پاکستانی سیاسی منظر نامے اور اس کے سماجی اثرات کا تجزیہ غیر جانبداری سے کیا ہے۔ بھٹو کے خلاف جنرل ضیاء الحق کا مارشل لا اور پھر آخر کار بھٹو کو رستے سے ہٹانے کے لیے پھانسی گھاٹ کر پہنچا دینا، پاکستانی تاریخ کے ایسے واقعات ہیں جن کی زخم آج بھی تازہ ہیں۔ بھٹو کی پھانسی پر جو عوامی جذبات تھے، طاہرہ اقبال کے ناول نیلی بار میں ان جذبات کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے بعد جنرل ضیاء الحق کے دور میں اسلام کے نام کی جانے والی سماجی اصلاحات، افغان جہاد کے لیے مجاہدین کی بھرتیاں اور تیاریاں اور بدلے میں مجاہدین اور حکومت کو ملنے والی مراعات اور ان کے سماجی اثرات، جنرل ضیاء الحق کا دیگر کئی افسران اور سفراء کے ساتھ طیارہ حادثہ میں جاں بحق ہونا سب کچھ اس ناول میں ایک تسلسل کے ساتھ ارتقائی انداز میں بیان کیا ہے۔ قاری یہ ناول پڑھتے ہوئے پاکستان کی عصری تاریخ کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

جنرل ضیاء الحق کے طیارے کے حادثے کے بعد ملک میں ہنگامی حالت کا نفاذ کر دیا گیا اور پھر جب جمہوریت کی بحالی کے لیے الیکشن کا اعلان کیا گیا تو محترمہ بے نظیر بھٹو وطن واپس آئیں۔ وطن واپسی پر بے نظیر بھٹو کا جو فقید المثال استقبال کیا گیا وہ پاکستانی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ بے نظیر بھٹو کو اپنی شخصیت سے زیادہ بھٹو کی بیٹی ہونے کی بنا پر پذیرائی ملی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پاکستانی سیاست پر چھا گئیں۔ وہ جہاں بھی جاتی عوام ان کے دیدار کے لیے بے تاب ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انتخابات ہوئے تو ان کی پاکستان پیپلز پارٹی جو اگرچہ گزشتہ کئی سالوں سے مشکلات کا شکار تھی، ایک بار پھر ملک کی بڑی عوامی اور جمہوری پارٹی بن

کر ابھری اور بے نظیر بھٹو نہ صرف پاکستان بلکہ اسلامی دنیا کی پہلی وزیر اعظم کے منصب پر فائزہ ہوئیں۔ بے نظیر بھٹو کی مقبولیت نے ایک بار پھر بھٹو کو زندہ کر دیا۔ عوام میں بے نظیر کی جو مقبولیت تھی اور جس طرح عوام نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا، طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار اس کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت کا خاتمہ مدت پوری ہونے سے قبل ہی کر دیا گیا۔ اس خاتمے پر جہاں ان کے مخالفین نے خوشی کے ڈونگرے برسائے وہاں عوام میں بے نظیر کے حامیوں میں سماجی سطح پر رد عمل بھی سامنے آیا۔ ناول نیلی بار ہمیں مختلف کرداروں کے مکالموں کے ذریعے اس رد عمل سے بھی آگاہی دلاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ناول نیلی بار میں سیاسی پالیسیوں اور ان کے اثرات کی زیادہ عکاسی نسائی کرداروں کے مکالموں کے ذریعے کی گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جس خطے کی کہانی سے یہ ناول تعلق رکھتا ہے، اس میں سماجی سطح پر خواتین کا کردار نمایاں ہے۔ سماجی سطح پر خواتین نہ صرف گھر کے امور سنبھالتی ہیں بلکہ مردوں کے شانہ بشانہ کھیتوں میں بھی کام کرتی ہیں اور دیگر سماجی امور میں بھی ان کا کردار نمایاں ہے۔ اس وجہ سے سماج پر پڑنے والے اثرات سے بھی وہ خوب آگاہی رکھتی ہیں اور کے موافق یا مخالف اپنے رد عمل کا اظہار بھی کرتی ہیں۔ اس اظہار میں بے نظیر کی حمایت میں سامنے آنے والے مکالموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے غم کو بھی بھلا نہیں پائی تھے۔ ناول نیلی بار میں جہاں بھی بے نظیر کی حکومت کے خاتمے کے خلاف عوامی بول چال میں رد عمل سامنے آتا ہے وہاں ساتھ ہی بھٹو کی مظلومت کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے ناول کی کہانی میں کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ اس انداز سے کیا ہے کہ سماجی کرداروں کے دل و دماغ میں بھٹو اور بے نظیر کے لیے پائی جانے والی محبت اور خلوص سامنے آتا ہے۔

بے نظیر کی حکومت کے خاتمے کے بعد پاکستانی سیاسی تاریخ میں خاصی ہنگامہ خیزی دکھائی دیتی ہے۔ چند ہی سالوں میں دو بار بے نظیر اور دو بار نواز شریف کا اقتدار میں آنا اور رخصت ہونا اور پھر جنرل پرویز مشرف کا مارشل لاء، اس دوران میں امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی اور اس کے نتیجے میں امریکہ کا افغانستان میں ڈیرہ ڈالنا، ایسے واقعات ہیں جنھوں نے پاکستان کے سیاسی منظر نامے کے ساتھ ساتھ سماج کو بھی خاصا متاثر کیا۔ طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار ان سب تاریخی واقعات اور ان کے زیر اثر پروان چڑھنے والے سماجی حالات کو بڑی مہارت سے سامنے لاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول میں انھوں نے نیلی بار کے خطے کے مخصوص تہذیبی و ثقافتی منظر نامے اور عوام کی اپنی تہذیب و ثقافت سے محبت اور لگاؤ کو بھی بیان کیا ہے۔ یوں یہ ناول پاکستانی سیاسی تاریخ اور سماجی حالات کی اہم دستاویز بنتا دکھائی دیتا ہے۔ عصری تاریخ کا جس طرح بیان

اس ناول میں ادبیت کے حسن کے ساتھ کیا گیا ہے، ایسا بہت کم ناولوں میں دکھائی دیتا ہے۔ سماجی حوالے سے اس ناول کا جائزہ لیا جائے تو اس میں سماجی حقائق اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ سماجی حقائق کے بیان کے حوالے سے حقیقت پسندی کا یہ رجحان اس لیے بھی غالب ہے کہ طاہرہ اقبال نے اس سماج میں وقت گزارا ہے۔ یہ سماج نہ صرف ان کے مشاہدے میں رہا ہے بلکہ ان کی زندگی کے تجربات کا بھی حصہ ہے۔ زندگی کے تجربات کا یہ بیان جب ناول کے قالب میں ڈھل کر سامنے آتا ہے تو اصلیت اور حقیقت کا انداز اپنائے ہوتا ہے۔ طاہرہ اقبال کے ناولوں میں یہ اصلیت اور حقیقت سیاسی اور سماجی اور دونوں حوالوں سے سامنے آتی ہے۔

جہاں تک ان دونوں ناولوں کے سیاسی وسماجی انداز میں تقابل کا تعلق ہے تو، طاہرہ اقبال کے ہاں ہمیں اس حوالے سے افتراکات اور اشتراکات دونوں رویے ملتے ہیں۔ انھوں نے ایک طرف تنوع سے کام لیتے ہوئے دونوں ناولوں کے زمانی اور مکانی فرق کو سامنے رکھا ہے وہاں دونوں ناولوں کی کہانیوں میں واقعات کے حوالے سے پائے جانے والے اشتراکات بھی سامنے آتے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے ان دونوں ناولوں کو سماجی اور سیاسی دونوں حوالوں سے ایک دوسرے میں مدغم ہونے سے بچایا ہے اور دونوں ناول جس جس خطے سے تعلق رکھتے ہیں، اس کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ملکی اور عالمی سیاسی وسماجی منظر نامے کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو طاہرہ اقبال کے ناولوں میں سیاست وسماج اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔

نتائج:

سیاسی وعصری تاریخ کے عروج وزوال کی داستان اور تغیر پذیر سماج ہے۔ پوٹھوہار کی پوری تاریخ بتاتی ہے عا

اس تحقیقی کام میں طاہرہ اقبال کے ناولوں گراں اور نیلی بار کے مطالعے اور ان کے تحقیقی وتنقیدی تجزیے کے ساتھ ساتھ ان ناولوں کے بارے میں دیگر محققین اور ناقدین کی آراء بھی پیش نظر رہیں۔ تحقیقی وتنقیدی عمل کے دوران میں جو نتائج سامنے آئے ان کا تفصیلی تذکرہ گزشتہ ابواب میں ان ناولوں کے سیاسی وسماجی تجزیے کے دوران میں کیا جا چکا ہے۔ یہاں ان نتائج کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے۔

☆ طاہرہ اقبال کے ناولوں میں سیاسی و عصری تاریخ کے عروج و زوال کی داستان اور تغیر پذیر سماج دکھائی دیتا ہے۔ دونوں ناولوں میں پوٹھوہار کی پوری تاریخ بتائی ہے جس میں علاقائی، جغرافیائی اور

نفسیاتی تاریخ کی طرف بھی واضح اشارے ہیں۔ قبل از تقسیم سے لے کر موجودہ عہد تک تاریخ و ثقافت اور تہذیب کا امتزاج گراں میں نمایاں نظر آتا ہے۔

☆ طاہرہ اقبال کے ناول گراں میں سیاست سے زیادہ سماج کی پیش کش دکھائی گئی ہے۔ یہ سماج تقسیم سے قبل کے مشترکہ ہندوستانی سماج سے لے کر تقسیم کے بعد پاکستان میں بیسویں صدی کے آخر تک پھیلا ہوا ہے۔ اس عہد میں سماج میں ہونے والی مختلف تبدیلیوں، ان تبدیلیوں کے سماجی باشندوں پر اثرات اس ناول میں ادبیت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ پوٹھوار کے خطے کی تہذیبی، ثقافتی، سماجی، اور اقتصادی صورت حال گاؤں کے ماحول کو مد نظر رکھتے ہوئے ناول گراں کا حصہ بنائی گئی ہے۔

☆ طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار پاکستان کی عصری تاریخ کے حوالے سے اہم ناول ہے۔ اس ناول میں قیام پاکستان سے لے کر اکیسویں صدی کے ابتدائی چند سالوں تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ عرصہ نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی سطح پر بھی خاصا ہنگامہ خیز دور ہے۔ اس دور میں تقسیم ہند، سقوطِ ڈھاکہ، افغان جہاد، پاکستان میں لگنے والے چار مارشل لاء، ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی، امریکہ کا افغانستان پر حملہ آور ہونا ایسے واقعات ہیں جنھوں نے عالمی سیاسی و سماجی منظر نامے کو متاثر کیا۔ طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار اس سیاسی سماجی منظر نامے کی بہترین تصویر پیش کرتا ہے۔

☆ تاریخ کو ناول کا حصہ بنانے کے باوجود طاہرہ اقبال کے ناول ادبیت کی شان سے معمور ہیں۔ ناول پڑھتے ہوئے قاری کو کہیں بھی یہ احساس نہیں ہونے پاتا کہ وہ کسی مؤرخ کی تحریر پڑھ رہا ہے بلکہ وہ ایک ناول نگار ہی کے طور پر ہی سامنے آتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں پائی جانے والی ادبیت تاریخ کو دلچسپ بھی بناتی ہے اور تاریخ کے ساتھ ساتھ سماج کی تصویر کشی میں معاونت بھی کرتی ہے۔

☆ طاہرہ اقبال کا شمار ایسے ناول نگاروں میں ہوتا ہے جن کے ناول جدید عہد کے سماجی اور سیاسی منظر نامے کی تصویر جذبات سے زیادہ حقیقت نگاری کے عنصر کے تحت پیش کرتے ہیں۔ اس حقیقت نگاری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے جس عہد اور جس ماحول کو ناولوں کا حصہ بنایا ہے، اس کا انھوں نہ صرف گہرا مشاہدہ کیا ہے بلکہ کسی حد تک یہ عہد اور ماحول ان کے تجربے کا حصہ بھی بنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں سماج اور تاریخ دونوں کے بیان میں ہمیں حقیقت نگاری کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے۔

سفارشات/تجاویز:

طاہرہ اقبال کے فکر وفن پر اس سے قبل بھی کئی اسکالرز نے مقالے تحریر کیے، اس کے علاوہ اس مقالے کی تیاری کے دوران میں ان کے فکر وفن کا مطالعہ تاریخ اور سماج کے تناظر میں کیا گیا ہے۔ دوران مطالعہ اپنے موضوع پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بہتر نتائج کی طرف گامزن رہا۔ تاہم اس مطالعے سے یہ ظاہر ہوا کہ ہے ابھی ان ناولوں کی کئی دیگر جہات تشنہ ہیں۔ مستقبل کے محقق اور نقاد کے لیے ان ناولوں کی جن جہتوں کو موضوع بنایا جاسکتا ہے ان کے بارے میں چند سفارشات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

☆ طاہرہ اقبال کے ناولوں کے فکری وموضوعاتی جائزے پر جامعات میں تحقیق مقالہ جات لکھے جاتے رہے ہیں، لیکن ان کے ناولوں میں بیانیہ کی تکنیک کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے ناولوں میں بیانیہ کی مختلف تکنیکوں سماجی حقیقت نگاری، شعور کی رو، نفسیاتی حقیقت نگاری، فلیش بیک، فلیش فارورڈ اور بیانیہ وسیلوں مثلاً بیک سٹوری، چیخوف گن، کلف ہینگر، ریڈ ہیرنگ، ان میڈیاس، ڈیوس ایکس مشین کا کھوج لگایا جائے، اور اس پر باقاعدہ مقالہ جات تحریر کیے جائیں۔

☆ جدید عہد خاص طور پر بیسویں صدی کے آخر اور اکیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں بدلتی ہوئی عصری حسیت کو مد نظر رکھتے ہوئے طاہرہ اقبال کے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ بھی اہم موضوع بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ناولوں میں بدلتی ہوئی اقتصادی صورت حال اور اس کے سماجی اثرات کو بھی موضوع تنقید بنایا جاسکتا ہے۔ اس سے طاہرہ اقبال کی ناول نگاری کی تفہیم وتنقید کی نئی راہیں کھلیں گی۔

کتابیات

کتابیات

آر لنٹن (R. Linton)(مرتبہ) *The Science of Man in the world crisis*۔ کولمبیا یونی ورسٹی پریس، ۱۹۴۵ء۔

اقبال، طاہرہ۔ گراں۔ اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء۔

اقبال، طاہرہ۔ نیلی بار۔ اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء۔

اقبال، ظفر۔ نیلی بار۔ طاہرہ اقبال کا نیا ناول (کالم) مطبوعہ، روزنامہ دنیا، لاہور: ۲۷ اپریل ۲۰۱۷ء۔

بٹ، محمد افضال۔ اردو ناول میں سماجی شعور۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، طبع دوم، ۲۰۱۵ء۔

تارڑ، مستنصر حسین۔ قلعہ جنگی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

ٹیلر، ایڈورڈ بی (Tylor, Edward B.)۔ *Primative Culture*۔ شمارہ نمبر ۱، لندن: جان مرے لمیٹڈ، ۱۸۷۱ء۔

جالبی، جمیل۔ پاکستانی کلچر۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۵ء۔

جبین، نگینہ۔ اردو ناول کا سیاسی وسماجی مطالعہ: ۱۹۴۷ اور اس کے بعد۔ الٰہ آباد: اے دریا آباد، ۲۰۰۲ء۔

حسن، سبط۔ ماضی کے مزار۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۷ء۔

حسین، صفدر۔ پاکستان کی تعمیر نو: فلسفہ او رلائحہ عمل۔ لاہور: نگارشات، ۱۹۹۲ء۔

حق، حقی۔ کوڑھ کی کاشت۔ طبع ششم، لاہور: شفیق پبلی کیشنز، جولائی ۲۰۰۰ء۔

حیدر، قرۃ العین۔ آخر شب کے ہم سفر۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء۔

خاں، ممتاز احمد۔ اردو ناول کے چند اہم زاویے۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، اشاعت دوم، ۲۰۱۶ء۔

دیویندر سرا۔ "ادب اور تہذیب کا بحران" مشمولہ: گفتگو، جلد ۱، شمارہ ۲، ۱۹۶۷ء

راشد الخیری، مجموعہ راشد الخیری۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔

سدید، انور۔ اردو ادب کی تحریکیں۔ کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء۔

سلیم، احمد۔ ٹوٹی بنتی اسمبلیاں۔ لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۰ء۔

شیخ، ریاض احمد۔ پاکستان۔ جمہوریت اور فوجی مداخلتیں۔ لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔

طفیل، امجد۔ "پاکستانی اردو ناول اکیسویں صدی کی ابتدائی دہائی میں" مشمولہ: اردو ناول کی پیش رفت، از منصور خوشتر۔

ظہیر، سجاد۔ روشنائی۔ لاہور: القمر پبلشرز، ۲۰۰۶ء۔

عالم، شیبا۔ اردو کے نمائندہ ناول نگاروں کا تاریخی شعور۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء۔

عباد، ابو بکر۔ اردو ناول: ارتقا سے ترقی پسند تحریک تک۔ مشمولہ، اردو ناول کی پیش رفت، مرتبہ منصور خوشتر، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۹ء۔

فاروقی، اعجاز۔ پاکستان کا فکری بحران۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔

کولن، ایلنز فریڈرک کولن (Kullen, Allans Frederick)، *Webster,s new illustrated dictionary*، (نیویارک: رینسٹ ہکس، ۱۹۷۰ء)، ص ۶۲۸۔

مرزا، مبین۔ "اکیسویں صدی کے دو عشروں میں اردو ناول پر اجمالی نظر" مشمولہ: ادبیات۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات، شمارہ ۱۲۳۔ ۱۲۴، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء۔

مصباح اللغات۔ کراچی: مدینہ پبلشنگ کمپنی، ایم اے جناح روڈ، مارچ ۱۹۸۲ء۔

المنجد الاشاعت۔ کراچی: اردو بازار، جولائی ۱۹۷۵ء۔

نسیم، عابدہ۔ اردو ناول میں مہاجرین کے مسائل۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، طبع اوّل، ۲۰۱۸ء۔

نواز، شاہد۔ پاکستانی اردو ناول میں عصری تاریخ۔ سرگودھا، شعبہ اردو یونی ورسٹی آف سرگودھا، ۲۰۱۸ء۔

یوسف، ایس۔ ایم۔ اسلامک کلچر۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، ۱۹۷۸ء۔

Oxforf English dictionary۔ جلد دوم، لندن: آکسفورڈ، کلرینڈن پریس، ۱۹۶۱ء۔